

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچویں شیشہ نامی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

شیشہ نامی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بروجہ اضافہ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اسی مہینے کے اندر نہ دی گئی تو آئندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پانچ گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنی ۸ کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔
مینجر "نگار"

شمار	فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۰۶ء	جلد ۳۸
------	---------------------------	--------

۲	ملاحظات	
۹	اُس لڑائی کے بعد اور اس لڑائی سے پہلے	
۱۸	شہرت عام کا دربار	سراج احمد علوی
۲۵	کارگاہ قدرت میں عزم انسانی کی دلچسپ داستان	
۳۱	عقل کی حاکمیت	
۳۳	سُہاگ	مرزا ظفر الحسن بی۔ اے
۳۵	پروپیگنڈا	خواجہ احمد فاروقی بی۔ اے
۴۲	اعترافِ گناہ	انور
۵۴	مساکانہ جی اور فلسفہ عدم تشدد	رام
۵۶	مکتوبات نیاز	
۶۱	باب الاستفسار	
۶۶	مطبوعات موصول	
۷۱	منظومات	تمکین۔ اثر۔ کوکب۔ ماہر۔ فراق۔ راج۔ ساحر۔ محب۔ شور۔ جگر۔ نظر

نگار

ادیٹر: نیاز فتحپوری

جلد - ۳۸	اکتوبر ۱۹۴۰ء	شمار - ۴
----------	--------------	----------

ملاحظات

رفتار جنگ

فرانس کی شکست کے بعد، خیال کیا جاتا تھا کہ شاید برطانوی حکومت جرمنی سے صلح کر لے گی اور اگر مسٹر چمبرلین کی وزارت برسرِ اقتدار ہوتی تو غالباً صلح ہو بھی جاتی، لیکن چرچل کے زمانہ میں صلح کا کوئی امکان نہ تھا اس لئے نازی حکومت کی کوشش کے باوجود بھی لڑائی ختم نہ ہوئی اور جنگ کا ایک تیسرا دور شروع ہو گیا جو یقیناً زیادہ سخت و صبر آزما ہے۔

اس لڑائی کے چھڑنے سے پہلے ہٹلر اور اس کے رفیقوں نے لڑائی کا ایک پروگرام طیار کر لیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ فتح فرانس تک اس پروگرام کی تکمیل بالکل اسی طرح ہوتی رہی جس طرح انھوں نے سوچا تھا، لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے وہ یقیناً ان کی توقع کے خلاف ہے۔ پچھلا سال اس میں شک نہیں نازیوں کے لئے بہت مبارک ثابت ہوا اور یوروپ کا اتنا بڑا علاقہ ان کے ہاتھ آ گیا کہ جرمنی کی گزشتہ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ایک طرف پولینڈ سے لیکر ناروے تک، دوسری طرف حدودِ بالٹک سے فرانس تک اس وقت جدھر دیکھئے نازی جھنڈا لہ رہا ہے اور شمال یوروپ کی وہ تمام حکومتیں جو اپنی پیداوار دولت اور صنعت و حرفت کے لحاظ سے ایک خاص امتیازی مالک تھیں سب کی سب نازی اثر میں آ گئی ہیں۔ ناروے، ڈنمارک،

بلجیم، ہالینڈ اور لکسمبرگ سے زیادہ فرائش، اس وقت ہٹلر کی حکومت میں شامل ہے اور اگر لٹوانی موجودہ حدود پر ختم ہو جائے تو اس میں شک نہیں کہ نازی افواج دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کی عسکری قوت ہونے کا فخر لیکر واپس آئیں گی۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ کسی ملک کو فتح کر لینے سے زیادہ مشکل فتح کے نتائج کو قائم رکھنا ہے، چنانچہ ہٹلر کی بے چینیاں بھی اس وقت انھیں فتوحات کو قائم رکھنے سے متعلق ہیں۔

ہٹلر اچھی طرح جانتا ہے کہ کامیابی کی صورت میں بھی وہ یورپ کے ان ممالک پر قابض نہیں رہ سکتا جو اس کے قبضہ میں آچکے ہیں۔ کیونکہ وہاں کی آزاد قومیں غلامی کی زندگی کو عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتیں اور تیغ و تفتنگ کی حکومت عارضی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے وہ چاہتا ہے کہ جس وقت یہ جنگ ختم ہو تو علاوہ پولینڈ اور زیکو سلوکیا کے جن پر قبضہ رکھنا وہ اپنا قومی فرض سمجھتا ہے، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ، بلجیم اور فرائش کے بعض ساحلی مقامات پر بھی اس کا اقتدار قائم رہے اور ممالک یورپ کی جدید تنظیم نازی اثرات کے تحت قرار پائے۔

لیکن ان تمام امیدوں کی راہ میں برطانیہ کا سنگ گراں حائل ہے اور جب تک یہ مانع دور نہ ہو جائے ہٹلر کو اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، اس لئے بہ حالات موجودہ ملک گیر می کا سوال نہ جرمنی کے سامنے ہے نہ برطانیہ کے بلکہ یہ جنگ ہے "آمریت اور جمہوریت" دو متضاد اصول کی اور اس میں کلام نہیں کہ کرہ زمین کے بسنے والوں کی آئندہ قسمت کا فیصلہ بہت کچھ اس جنگ کے نتیجے پر منحصر ہے۔ یقیناً ہم برطانوی جمہوریت کو معیاری اصول حکومت نہیں کہہ سکتے، اور جس حد تک سیاہ فام قوموں کا تعلق ہے، دنیا کی کوئی سفید رنگ جمہوریت اپنے اُن فرائض کو ادا نہیں کرتی جو صحیح جمہوریت کے نقطہ نظر سے اس پر عاید ہوتے ہیں تاہم ایک بُری سی بُری جمہوریت بھی اچھی سی اچھی آمریت سے بہتر ہے اور اسی لئے ساری دنیا اس جنگ کے نتیجے کی طرف سے بہت فکر مند ہے۔

ہٹلر نے خیال کیا تھا کہ اس کی ہوائی مائخت، انگلستان کی آبادی میں بے چینی پیدا کر دے گی اور وہ اس بددلی سے فائدہ اٹھا کر برطانوی حکومت کو دبائے گا، لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ تین مہینے سے زیادہ زمانہ گزرا کہ وہ اس کوشش میں مصروف ہے لیکن اس وقت تک برطانوی آبادی کے عزم و ارادہ میں کوئی کمی پیدا نہ ہوئی۔

بالکل صحیح ہے کہ انگریزوں کی فضائی قوت اب بھی جرمنی سے کم ہے اور اب سے تین مہینے پہلے تو بہت ہی کم تھی (چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اگر جرمنی کے یہی ہوائی حملے انگلستان پر چند مہینے قبل ہوتے، تو شاید برطانوی حکومت برداشت نہ کر سکتی) لیکن اب اس کمی کو بڑی حد تک پورا کیا گیا ہے اور انگریزی جہاز بھی برابر کا جواب دینے لگے ہیں۔ اس لئے انگلستان پر حملہ کرنے کی جو اسکیم ہٹلر کے سامنے تھی وہ تقریباً ختم ہو چکی ہے اور جاڑوں میں تو خیر، یوں بھی اس کا کوئی امکان نہ تھا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر اس وقت جرمنی، انگلستان پر حملہ نہیں کر سکتا تو ہم اس لٹوانی کو ختم سمجھ لیں۔ جنگ براہِ جاری رہے گی اور ہو سکتا ہے کہ وہ اور زیادہ خطرناک وسعت اختیار کر لے۔

اس کے سمجھنے کے لئے، ہمیں یورپ کی بعض دوسرے ملکوں کی حالت پر بھی نظر ڈالنا چاہئے۔ لڑائی سے پہلے جہاں جہاں امکانات جنگ پائے جاتے تھے، وہیں اب بھی ہیں۔ بحر روم، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید یہ تین جگہیں ایسی تھیں جہاں آتش جنگ کے مشتعل ہو جانے کا اندیشہ کیا جاتا تھا اور یہ اندیشہ آہستہ آہستہ واقعہ کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔

فرانس کے مغلوب ہونے کے بعد جب اٹلی نے برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تو بحر روم میں جس لڑائی کے چھڑ جانیکا اندیشہ تھا وہ تو چھڑ گئی، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اٹلی نے یہ اقدام اس خیال و طیاری کے ساتھ کیا تھا کہ اسے عرصہ تک اس میں الجھ جانا پڑے گا۔ ملذیوں کی بڑھتی ہوئی فتوحات کو دیکھ کر مسوینی کو یقین ہو گیا تھا کہ اول تو برطانیہ کسی نہ کسی بہانہ سے صلح کر لے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر وہ جرمن حملہ کی تاب نہ لاسکے گا، گویا ۱۵ اگست تک ہٹلر کے داخلہ لندن پر اسے پورا بھروسہ تھا، لیکن جب نتیجہ خلاف امید نکلا اور لڑائی الجھ کر گئی تو ہٹلر کی طرح اسے بھی فکر ہوئی کہ آئندہ کیا کرنا چاہئے۔

ظاہر ہے کہ جنگ اب اس حد سے گزر چکی ہے کہ ہٹلر اور مسوینی خود اپنے اختیار سے اس کو ختم کر سکیں، وہ لڑنا نہ چاہیں گے تو بھی انھیں لڑنا پڑے گا، یہاں تک کہ کوئی ایک فریق ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو جائے۔ پھر اس صورت میں ہٹلر اور مسوینی کے سامنے بھی ایک تدبیر ہو سکتی ہے کہ وہ لڑائی کے دو چار محاذ اور پیدا کر کے برطانیہ کو اپنی قوت تقسیم کر دینے پر مجبور کریں۔ برطانیہ کے سامنے انگلستان کا سوال اتنا اہم نہیں ہے جتنا مشرقی مقبوضات اور خاص کر ہندوستان کا۔ اس لئے اگر اسے اپنے ان مقبوضات کے تحفظ کے لئے یورپ کی سرزمین سے باہر کہیں جنگ کرنا پڑی تو یہ اس کے لئے کوئی خالی ٹیکٹ نہ ہوگی۔ اور۔۔۔ پھر اس سلسلہ میں بحر روم، جبرالٹر اور نہر سوئز کا مسئلہ اس کے لئے بہت زیادہ اہمیت اختیار کر لے گا۔

مسوینی، بحر روم کو اطالوی جھیل کہتا ہے اور اس پر قبضہ کرنا وہ اپنا فطری حق سمجھتا ہے، لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ بحر روم برطانیہ حکومت کے لئے بھی شہ رگ کا حکم رکھتا ہے اور اگر آج پانی کا یہ حصہ اس کے لئے ناقابل گزر ہو جائے تو پھر مشرق سے اس کے تعلقات بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔

سب سے زیادہ اہم مقام جس کی حفاظت برطانیہ کے لئے ضروری ہے، جبرالٹر ہے جو اسپین اور افریقہ کے درمیان ۳۶ میل چوڑے بحری راستہ کا محافظ ہے، اگر جبرالٹر انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انگلستان کا کوئی جہاز نہ اسکندریہ پہنچ سکے گا اور نہ ہندوستان۔ اس وقت تک لڑائی کی خبروں میں جبرالٹر کا ذکر نہ آتا تھا، لیکن اب آنے لگا ہے اور نازی و فاسٹی حکومت کی طرف سے اسپین پر زور دیا جا رہا ہے کہ اگر وہ خود جنگ میں شریک نہ بنیں چاہتا تو نازی و اطالوی افواج کو اپنے ملک سے گزرنے کی اجازت دے۔ اسپین کا وزیر سوئیر برکن سے گفت و شنید کے بعد واپس جا چکا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جنرل فرینکو ملک کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے کبھی لڑائی کی ہمت نہ کرے گا، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ ہٹلر اور مسوینی کے کہنے کو مال نہیں سکتا، کیونکہ جس کی حکومت انھیں دو کی امداد سے قائم ہوئی ہے اور نازی افواج ہر وقت فرانس کے راستہ سے اس پر تاخت کر سکتی ہے۔

جبرالٹر پر بحر روم کی طرف سے نہ کوئی حملہ ہو سکتا ہے اور نہ اس کی کامیابی کا امکان، لیکن خشکی کی طرف سے براہ راست ہر وقت اس کا امکان ہے اور یہ بات ناممکن نہیں کہ پشت کی طرف سے حملہ کر کے جبرالٹر پر قبضہ کر لیا جائے یا اس کے استحکامات کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ حال ہی میں فرانس کے ہوائی جہاز حملہ ڈگر کے جواب میں جبرالٹر پر بم برسائے ہیں اور مشعر نہیں تو مشعر کے دباؤ سے جنرل میٹان کی فرانسیسی حکومت نے اس حملہ کی ابتدا کر دی ہے۔ اس لئے جبرالٹر کا مسئلہ بہت نازک ہوتا جا رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اسی موسم سرما میں یہاں لڑائی کی آگ مشتعل ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم یقین کے ساتھ کسی نتیجہ پر حکم نہیں لگا سکتے، لیکن ایک بات یقینی ہے کہ خشکی کے راستوں سے نازی افواج کا مقابلہ آسان نہیں اور نہ برطانوی فوجیں اسپین کی سرزمین تک پہنچ کر اس اقدام کو روک سکتی ہیں۔ ساحل کی طرف سے بیشک برطانوی فوجیں آٹاری جاسکتی ہیں، لیکن چونکہ ادھر بحر روم میں اطالیہ مزاحم ہوگا، اس لئے بحری راستہ سے بھی پوری کمک نہیں پہنچ سکتی

اس میں شک نہیں کہ امریکہ، روز بروز برطانیہ سے قریب ہوتا جا رہا ہے اور بالکل ممکن ہے کہ ایک دن دونوں جگہ کی فوجیں دوش بدوش کام کرتی نظر آئیں، لیکن امریکہ کی شرکت کے بعد بھی مسئلہ جبرالٹر کی دشواری بدستور قائم رہتی ہے اسی کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مشرق بعید میں جاپان کی پالیسی بہت جارحانہ ہوتی جا رہی ہے اور وہ نہ صرف انڈو چائنا، بلکہ برما اور سنگاپور پر بھی لچائی ہوئی نگاہیں ڈال رہا ہے تو ہمیں اس کا یقین ہو جاتا ہے کہ ڈکٹیٹروں کی حکومتوں نے آئندہ جنگ کا کیا نقشہ بنایا ہے

جاپان، اٹلی اور جرمنی کے درمیان جو معاہدہ حال ہی میں ہوا ہے اس کا مقصود بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ اور روس کو اس جنگ میں شریک ہونے سے باز رکھا جائے، لیکن فی الحقیقت یہ پیش قدمی ہے کہ کسی نہ کسی ایسا بہانہ پیدا کرنے کی جو مشرق میں بھی لڑائی کی آگ کو مشتعل کر دے۔ جاپان کا یہ تسلیم کر لینا کہ یورپ کی حکومتوں میں تنظیم جدید کا حق صرف جرمنی و اٹلی کو حاصل ہے اور جرمنی و اٹلی کا یہ مان لینا کہ مشرق میں اقتدار قائم کرنے کا استحقاق صرف جاپان کو حاصل ہے، آمرانہ حکومتوں کے آئندہ ارادوں پر کافی روشنی ڈال رہا ہے

ان تینوں حکومتوں کے اس معاہدہ نے بہت سے شبہات زایل کر دئے ہیں اور آئندہ نقشہ جنگ کے متعلق گوگو کی حالت بڑی حد تک دور ہو چکی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر جاپان کے اقدامات نے جن کا رخ فی الحال انڈو چائنا کی طرف ہے، کوئی صورت ایسی پیدا کر دی کہ امریکہ کو بھی جنگ میں شریک ہونا پڑا تو پھر یہ آگ جبرالٹر سے لیکر ہندوستان، بلکہ ہندوستان سے بھی آگے آسٹریلیا اور جزائر بحر ہند تک پھیل جائے گی اور دشمن کی کوشش یہ ہوگی کہ بحر روم کی طرف سے اٹلی و نازی افواج کا دباؤ اور مشرق کی طرف سے جاپانی قوت کا دباؤ ڈال کر دونوں ہندوستان کو اپنے درمیان میں لیلیں اور برطانیہ کو مجبور کر دیں کہ وہ اپنی توجہ انگلستان سے ہٹا کر ہندوستان کی طرف مبذول کرے

دوسرا محاذ جنگ غالباً یونان و شام کی سرزمین میں پیدا کیا جائے گا۔ چونکہ فرانس کی شکست نے اس کے مقبوضات

میں دو عملی کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ اجتماعی قوت کا شیرازہ درہم برہم ہو چکا ہے، اس لئے دوسرے مالک اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، انڈو چائنا میں جاپان جو کچھ کر رہا ہے، اس سے ہر شخص واقف ہے اور گمان غالب یہی ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائے گا، دوسری طرف شام سے اطالیہ نے جو مطالبات کئے ہیں ان کو رد کرنے کی ہمت بھی کسی میں نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یونان کو اپنے بعض جزائر بحر روم کے اٹلی کے حوالہ کر دینے پڑیں گے اور اگر اس نے ایسا نہ کیا، تو پھر لڑائی چھڑ جائے گی، جس میں ترکی کو بھی لامحالہ شریک ہونا پڑے گا۔ اس مسئلہ پر روس کی پالیسی البتہ بہت کچھ اثر انداز ہو سکتی ہے لیکن چونکہ رومانیہ پر نازی اثرات قائم ہو جانے کی وجہ سے بحر اسود میں روس کی آزادی باقی نہیں رہی، اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ یوں آسانی سے، نازی حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دے گا، گمان غالب یہی ہے وہ بدستور خاموش رہے گا اور جب تک کسی فریق کا جھکا ہوا دیکھنے کا تو اپنا وزن بھی اسی طرف ڈال دے گا

اس سے انکار ممکن نہیں کہ روس، کبھی اس کو پسند نہیں کر سکتا کہ جرمنی اور جاپان کامیاب ہوں، کیونکہ انھیں کی کمزوری اس کی اصل قوت ہے، لیکن وہ حتی الامکان ان سے جنگ کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس وقت تک جس پالیسی سے اس نے کام لیا ہے وہ اس کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ نصف پولینڈ بالٹک ریاستیں اور رومانیہ کا مشرقی علاقہ پر اس نے جس طرح قبضہ کیا ہے وہ دنیا کی تاریخ میں یادگار چیز ہے۔ اسٹالین کی انتہائی عقلمندی تھی کہ اس نے چمبرلین کی کمزور وزارت سے فائدہ اٹھا کر بغیر لڑے ہوئے یہ سب کچھ حاصل کر لیا، اور اس کی حماقت ہوگی اگر اس نے کسی فریق کے ساتھ شریک ہو کر جنگ میں حصہ لیا، کیونکہ اب اسے کچھ اور ملنا نہیں اور جو کچھ اس کو مل چکا ہے اس کی واپسی کا سوال فی الحال پیدا ہونا نہیں

وہ سمجھتا ہے کہ جنگ جو صورت اختیار کرے اس کا فائدہ ہے اگر برطانیہ کو شکست ہوتی ہے تو اس کا فی الحال کوئی نقصان نہیں، کیونکہ جرمنی کو یہ کامیابی اتنی مہنگی پڑے گی کہ شاید وہ عرصہ تک روس کا خیال دل میں نہ لاسکے، اور اگر جرمنی کو شکست ہوئی تو اسے یقین ہے کہ نازی دو ختم ہونے کے بعد وہاں اشتراکی دور ہی قائم ہو گا اور یہی اسٹالین کا عین مقصود ہے

سواحل بحر روم کے مسئلہ میں، مصر کا سوال بھی سامنے آتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اٹلی نے اس پر حملہ بھی کر دیا ہے، لیکن میری رائے میں یہ بات بہت مشکوک ہے۔ اس وقت تک جو خبریں آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مطروح، سلوم اور ایک اور مقام پر اٹلی نے حملہ کیا ہے، لیکن ان مقامات پر مصر کا پہلے ہی سے حقیقی معنی میں قبضہ نہ تھا اس لئے ان حملوں کو نہ مصر نے کوئی زیادہ اہمیت دی ہے اور نہ وہ ان حملوں کی وجہ سے جنگ میں شریک ہونا ضروری خیال کرتا ہے

حال ہی میں جو تبدیلیاں مصر کی وزارت میں ہوئی ہیں ان سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہاں کی حکومت ابھی تک جنگ کے لئے طیارہ نہیں اور وہ آخر وقت تک اس سے بچنا چاہتی ہے بشرط آنکہ اس پر کوئی غیر معمولی دباؤ نہ پڑا

اس سلسلہ میں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ کیا انگلستان تنہا ان تمام دشواریوں کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا ہے۔

اس وقت تک اس نے جرمن حملوں کو جس کامیابی سے دفع کیا ہے اس سے آئندہ کے لئے بہت کچھ امیدیں پیدا کر دی ہیں، لیکن اگر لڑائی مشرق بعید میں بھی شروع ہو گئی تو پھر اس میں امریکہ کو بھی شریک ہونا پڑے گا اور ان دونوں کی متحدہ قوت یقیناً نہ صرف بحر روم بلکہ بحر ہند میں بھی اٹلی اور جاپان کا مقابلہ آسانی سے کر سکتی ہے۔

لیکن اگر یہ آگ مشرق بعید تک نہ پہنچی اور مشرق وسطیٰ تک محدود رہ گئی تو پھر سب کو ترکی کا منہ دیکھنا پڑے گا اور اسکے اختیار میں ہوگا جس کا پلہ چاہے جھکا دے۔ اس وقت تک ترکی کا رجحان، برطانیہ کی طرف ہے، لیکن آئندہ اس کے مصالح کیا ہوتے ہیں، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

بہر حال موسم سرما دنیا کے لئے بہت سے تلخ تجربات اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ کس کے حصہ میں کتنی تلخیاں آئیں گی۔

ایک زمانہ سے ان تینوں کے درمیان ہندوستان کے موجودہ و آئندہ نظام کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے، لیکن ہنوز کوئی فیصلہ نہیں ہوا، اور

کانگریس، مسلم لیگ اور حکومت ہند

نہ ہونے کی توقع ہے

سب سے آخری فیصلہ، کانگریس کیا بلکہ مہاتما گاندھی نے کیا تھا کہ اگر حکومت اہل ہند کو اتنی انفرادی آزادی دیدے کہ جنگ کے متعلق ہر شخص اپنی رائے کا اظہار کھلم کھلا کر سکے (خواہ وہ جنگ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو)، تو کانگریس، حکومت کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہے۔

اس تجویز کی چھپی ہوئی مصلحت جو کچھ ہو، لیکن بظاہر اس سے زیادہ بے معنی بات کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ اس کا مفہوم صرف یہ قرار پاتا ہے کہ ”ہم جنگ میں انگریزوں کی مدد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں بشرط آنکہ ہم کو مدد نہ دینے کا اختیار حاصل ہو“۔ اس مطالبہ کا جو نتیجہ ہونا تھا، وہی ہوا، یعنی ولسرائے نے اس کو مسترد کر دیا۔ اب گاندھی جی کیا کریں گے؟ کونسی نئی صورت مفاہمت کی اختیار کریں گے؟ اس کا علم شاید گاندھی جی کو بھی نہ ہوگا، کیونکہ جس روحانیت یا آسمانی قوت کے اشارہ سے وہ کسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں، اس کے پاس شاید اس سے زیادہ عجیب تجویز اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ انفرادی طور پر ستیاہ گرہ سے کام لیا جائے اور جنگ کے خلاف تقریریں کر کر کے لوگ جیل جانا شروع کر دیں، لیکن اس امکان میں بھی گاندھی جی کا اذعان حایل نظر آتا ہے۔

حکومت کہتی ہے کہ ایک طرف تم یہ بھی کہتے جاتے ہو کہ ہندوستان کو ہم آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اور نازی حکومت کو کبھی گوارا نہیں کر سکتے، لیکن دوسری طرف برطانیہ کو فوجی مدد دینے کے خلاف اظہار رائے کی آزادی بھی چاہتے ہو یہ دونوں باتیں کیونکر پوری ہو سکتی ہیں۔

کانگریس، حکومت کے اس اعتراض کا جواب صاف صاف نہیں دینا چاہتی، ورنہ وہ اس کے جواب میں یہ

پوچھ سکتی ہے کہ کیا برطانیہ کی شکست اس کو مستلزم ہے کہ نازی حکومت ہندوستان میں قائم ہو جائے اور کیا برطانیہ کی فتح کا لازمی نتیجہ آزادی ہندوستان ہے؟

اس وقت حکومت ہند اور کانگریس دونوں ایک دوسرے کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب تک ایک دوسرے پر اعتماد نہ ہو کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اگر گاندھی جی کو یقین ہے کہ اس وقت ستیاگرہ کامیاب نہیں ہو سکتی تو انھیں صاف صاف کہہ دینا چاہئے اور مختلف بہانوں سے اس فیصلہ کو ٹالتے رہنے کی کوشش نہ کرنا چاہئے اور اگر حکومت واقعی ہندوستان کو آزادی دینا چاہتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ابھی سے اس کی داغ بیل ڈالنے کا ارادہ نہ کرے

مسلم لیگ کی روش اور زیادہ حیرت انگیز ہے۔ جب وہ یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے، ایک حصہ مسلمانوں کے لئے مخصوص ہو جانا چاہئے اور دوسرا ہندوؤں کے لئے، تو پھر اس کو اس وقت تک حکومت سے تعاون نہ کرنا چاہئے، جب تک اس تقسیم کا یقین نہ ہو جائے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسٹر جینا مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ کہہ رہے ہیں، ان کا تعلق صرف اکثریت و اقلیت کے جھگڑوں سے ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اگر مرکزی حکومت میں مسلم نیا بت ان کی مرضی کے مطابق ہو جائے تو شاید وہ پاکستان کی تجویز کو بھی معرض التوا میں ڈال دیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ جاپان کی موجودہ پالیسی نے ہندوستان کو بھی خطرہ سے قریب تر کر دیا ہے اور یہ فیصلہ کرنا ہمارے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ برطانیہ کے ساتھ تعاون کرنا ہمارے لئے مفید ہو گا یا نہیں۔ اگر ہم کو یقین ہے کہ انگریزوں کی مدد کے بغیر ہم اپنی حفاظت و مدافعت کر سکتے ہیں تو خیر، ورنہ ہم کو ایسے وقت میں کوئی ایسی بحث پیش نہ کرنا چاہئے جو حکومت اور اہل ہند دونوں کو تذبذب کی حالت میں رکھے

یقیناً ہم کسی غیر حکومت کو یہاں نہیں دیکھنا چاہتے، لیکن اگر اس کا امکان ہے کہ یہاں جاپان یا جرمنی کی حکومت قائم ہو سکتی ہے، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ برطانوی حکومت کو گوارا نہ کیا جائے، جو یقیناً دوسری حکومتوں کے مقابلہ میں ہمارے مطالبات کو زیادہ رواداری کے ساتھ سن سکتی ہے

”نگار“ جنوری ۱۹۴۷ء

کے متعلق تفصیلی بیان صفحہ ۶۰ پر ملاحظہ فرمائیے۔

اُس لڑائی کے بعد اور اس لڑائی سے پہلے

(مسلل)

ہٹلر کا ابتدائی عروج ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ پچھلی لڑائی کے بعد جرمنی میں جمہوریت کا قیام ہو گیا تھا، لیکن اسکی حالت بہت متزلزل تھی، مختلف جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں اور ہر ایک اپنا اقتدار چاہتی تھی انھیں میں ایک جماعت ہٹلر کی تھی جو قومی اشتراکیت کی علمبردار تھی، لیکن اس کا مقصد صرف جماعتی اقتدار قائم کرنا تھا۔ مئی ۱۹۳۲ء سے مارچ ۱۹۳۳ء تک پانچ مرتبہ انتخاب عمل میں آئے اور ہر بار نازی جماعت نے اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے آسمان و زمین ایک کر دیا۔ نازی جماعت کی مخالفت سب سے زیادہ کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے ہو رہی تھی اور ہٹلر اسی پارٹی کے توڑنے کی فکر میں تھا۔ نازی پارٹی نے ملک کو کمیونسٹ جماعت کی طرف سے بدظن کرنے کے لئے رشتہ نگاری میں آگ لگا دی اور الزام رکھا کمیونسٹ لوگوں پر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہٹلر کو زیادہ ووٹ مل گئے اور حکومت کا بایاں بازو بالکل کمزور ہو گیا۔

نازی پارٹی نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد گٹا پو کے ذریعہ سے تمام مخالف لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ہلاک کرنا شروع کیا، اور اپنی آہنی گرفت سے جاہلانہ تسلط قائم کرنے میں اسے کامیابی حاصل ہو گئی۔

پھر جرمنی کا یہ انقلاب کوئی معمولی بات نہ تھی جس سے دول یورپ متاثر نہ ہوتے، لیکن انھوں نے زیادہ دور رس نگاہ سے کام نہیں لیا اور نازی حکومت کے خلاف کوئی ایسی متحدہ پالیسی قائم نہیں کی جو اس خطرہ کو زیادہ وسیع نہ ہونے دیتی۔

برطانیہ میں ہٹلر کے خلاف بجائے غصہ کے ہمدردی کے جذبات پیدا تھے۔ لندن کے دو متمند لوگ اسکور وپیہ قرض دینا چاہتے تھے، بعض کا خیال تھا کہ اگر دوسرے ملکوں کی قربانی چڑھا کر ہٹلر کو خوش کیا جاسکتا ہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ ایک جماعت کھلم کھلا، برطانیہ و جرمنی اتحاد کی حامی تھی اور نیول چیپر لین کو اپنے والد کی رائے یاد آ رہی تھی جس میں صاف صاف ظاہر کیا گیا تھا کہ:-

”اگر جرمنی سے ہمارا اتحاد ہو جائے تو ہم دنیا کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر لیں اور پھر کسی کو امن شکنی کی جرأت نہ ہو۔“

ہم فرانسیسیوں سے بگاڑنا نہیں چاہتے، لیکن جرمنی والوں کی طرح ان میں جوش و دلول کہاں۔

ہم زیک اور پولستان کے لوگوں کو بھی یہی مشورہ دیتے ہیں کہ وہ جرمنی کو اس کی مطلوبہ رعایتیں دیں، ورنہ نتیجہ ان کے غلات ہوگا، اگر جرمنی مشرقی یورپ میں بڑھنا چاہتا ہے تو بڑھے ہم سے کیا واسطہ، اچھا ہے اسکی قوتیں اسی طرف صرف ہوں، ہمارے لئے مشرقی یورپ کے بازاروں کو سمجھانا زیادہ فائدہ مند نہیں۔ رہا جرمن نوآبادیوں کا مسئلہ، سو اس کے لئے ہم چنوہ کی خمرست کھولیں گے تاکہ افریقہ میں اس کی نوآبادیاتی سلطنت قائم ہو جائے۔ اس خمرست میں سب سے پہلے ہمارا اور فرانس کا نام ہوگا لیکن ہمیں ملجیم، پرتگال اور جنوبی افریقہ والوں سے بھی امید ہے کہ وہ کافی مدد کریں گے۔

محکمہ خارجہ کے لوگ خواہ مخواہ سیدھی سادی باتوں کو الجھاوے میں ڈال دیتے ہیں۔ برطانیہ کی خارجہ پالیسی کا صرف ایک مقصد ہونا چاہئے اور وہ یہ کہ جرمنی سے دوستی پیدا کی جائے۔“

یہ تھا خیال برطانیہ کے بعض بڑے بڑے آدمیوں کا جس کا سلسلہ برابر ۱۹۳۳ء تک جاری رہا۔ بعض نے اس کی مخالفت میں کہا کہ جرمنی سے اتحاد پیدا کرنے کی جگہ اس کی راہ میں متحدہ سلامتی ریاستوں کی دیوار قائم کر دینا چاہئے تاکہ وہ مغرب کی طرف نہ بڑھ سکے، لیکن اسے کسی نے نہ سنا۔ البتہ طبقہ عمال اور ٹریڈ یونین کے لیڈر ضرور نازیوں کے مخالف تھے کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ جرمنی میں نازی حکومت نے طبقہ عمال کی آزادی چھین لی ہے اور تجارت پیشہ لوگوں کے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ لیکن برطانیہ کی نرم پالیسی والے لوگ ان باتوں کو نہ سمجھتے تھے، وہ برابر ہی کہتے آرہے تھے کہ جرمنی سے جنگ کو تاہذیب کو ختم کر دیتا ہے۔

الغرض یہ تھی برطانیہ کی پالیسی جب ہٹلر برسرِ اقتدار ہوا اور جس سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر کر دیا۔

۱۹۳۳ء کو ہٹلر نے ریشٹاگ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

”جرمنی ان راہوں سے ہٹنا پسند نہیں کرتا جو صلح کے معاہدات نے متعین کر دی ہیں اور ہم کسی ملک پر حملہ کرنا نہیں چاہتے۔“

لیکن اسی صبح کو ڈاکٹر راشٹنگ (Dr. Rauehning) سے ہٹلر یہ گفتگو کر چکا تھا کہ:

”میں ہر معاہدہ کے لئے طیار ہوں، ہر صلح نامہ پر دستخط کر دوں گا، لیکن میں جانتا ہوں کہ ایک دن یہ سب معاہدے گر رہیں گے۔“

۱۹۳۵ء میں برطانیہ کی مختلف پارٹیوں کے درمیان یہ بحث شروع ہوئی کہ غیر مسلح بنانے والی ہٹلر مسلح ہوتا ہے کانفرنس (Disarmament Conference) میں برطانیہ کی پالیسی کیا ہونا

چاہئے، لیکن یہ گفتگو کسی خاص نتیجہ تک نہ پہنچ سکی۔ بعض کا خیال تھا کہ جرمنی کو مسلح ہو جانے کی اجازت ضرور دینا چاہئے تاکہ فرانس و بارہے، بعض اس کے مخالف تھے۔ آر تھر ہنڈرسن (وزیر خارجہ اور کانفرنس کے صدر) تحفیف اسلحہ کے قابل ضرور تھے لیکن ایک متعین و محدود صورت میں۔

جب ۱۹۳۲ء میں یہ کانفرنس جنیوا میں منعقد ہوئی تو کم برس آنے والے جہازوں کو تو یقیناً ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جاتا اور ایک بین الاقوامی ہوائی پولیس کے سپرد اس کی نگرانی ہو جاتی، لیکن برطانیہ نے اس کی مخالفت کی کیونکہ وہ خود اپنے آپ کو ایسے جہازوں سے محروم کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کم برس آنے والے جہاز رکھنے کی اجازت تمام ملکوں کو دیدی گئی اور پھر نے اپنی جانشیری کی ابتداء ہی میں گوئنگ کو حکم دیدیا کہ ساری توجہ ہوائی طاقت بڑھانے پر صرف کی جائے جسکی اطلاع وقتاً فوقتاً برطانوی پارلیمنٹ کو پہنچتی رہتی تھی لیکن وہ اس کو شکرمال جاتے تھے یہاں تک کہ مسٹر بالڈون نے نومبر ۱۹۳۲ء میں اس کا اعتراف کیا بھی تو ان کمزور الفاظ میں کہ ”واقعی جرمنی اپنی ہوائی طاقت بڑھا رہا ہے“ درانحالیکہ اسوقت تک اس کی فضائی قوت خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی۔

اس کے بعد جب ۱۹۳۵ء میں سر جان سائمن اور مسٹر ایڈن نے خود برلن جا کر حالات کا مطالعہ کیا تو اسوقت بھی وہ یہی خیال لیکر آئے کہ برطانیہ کی ہوائی طاقت ہنوز بڑھی ہوئی ہے۔ یہ مغالطہ کیوں ہوا۔ اس قسم کی غلط اطلاعات کیوں پہنچائی گئیں، اس کا کوئی صحیح جواب نہیں دیا جاسکتا، لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ برطانیہ کی ترم پالیسی رکھنے والے اسی قسم کی خبریں سننا پسند کرتے تھے اور ان پر یقین کر لینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

آخر کار ۱۹۳۸ء اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جرمنی غیر مسلح کرنے والی کانفرنس سے علیحدہ ہو گیا اور جمیت اقوام سے استعفا دینے کا نوٹس بھی دیدیا اور اس کے بعد ہی اس نے نہایت زور شور سے فوجی تیاریاں شروع کر دیں اور ۱۹۳۳ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک فوجی آراستگی پر ۲۰۰ بلین پونڈ صرف کر دئے، گویا برطانیہ نے ۱۹۳۶ء سے لیکر ۱۹۳۵ء تک گیارہ سال میں جتنا صرف کیا اس سے دو چند جرمنی نے صرف تین سال میں صرف کر دیا یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ برطانیہ نے جتنا سولہ سال میں صرف کیا تھا اس سے زیادہ جرمنی نے تین سال کے اندر صرف کیا۔ دنیا کی تاریخ میں یہ بالکل پہلی مثال تھی کہ کسی ملک نے اتنی قلیل مدت میں اتنی بڑی رقم فوجی آراستگی پر صرف کی ہو۔

۱۲ نومبر ۱۹۳۶ء کو مسٹر بالڈون نے دارالعوام میں جو تقریر کی وہ سننے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں:

”۱۹۳۳ء میں میرے دوست پریشان تھے کہ یورپ میں یہ آخر ہو کیا رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ یہ زمانہ وہ تھا

جب غیر مسلح بنانے والی کانفرنس کے اجلاس جنیوا میں ہو رہے تھے اور برطانیہ میں صلح کن پالیسی کا یہ زور تھا کہ ایک ممبر سات ہزار ووٹ سے صرف اس لئے ہار گیا کہ اس کی پالیسی اس کے خلاف تھی۔ پھر غور کیجئے کہ اگر ایک پارٹی کا لیڈر ہونے کی

حیثیت سے میں ملک کو یہ خبر سناتا کہ جرمنی دوبارہ مسلح ہو رہا ہے اور ہمیں بھی اس کے مقابلہ میں مسلح ہونا چاہئے تو

اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ میں شاید بہت زیادہ دوڑوں سے مار جاتا۔“

آپ نے دیکھا کہ برطانیہ کا وزیر اعظم صرف اس ڈر سے کہ مبادا اس کا انتخاب نہ ہو سکے زمانہ کی رو میں بہ جاتا ہے اور آنے والے خطرہ کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔

۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کو مسٹر چرچل نے ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ظاہر کیا کہ:

”میں نے ۱۹۱۷ء ہی میں مسٹر بالڈون کو مطلع کر دیا تھا کہ جرمنی غلبہ پر ہوائی طاقت بہت بڑھا رہا ہے، لیکن اسکو

باور نہ کیا گیا، لیکن چھ مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ مسٹر بالڈون کو اپنی غلطی تسلیم کرنا پڑی، لیکن ان کے بعد مسٹر چمبرلین کی وزارت

شرع ہوئی جن کی قوت فیصلہ، بالڈون سے زیادہ کمزور تھی اور آج ہم اسی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔“

چنانچہ مسٹر ڈالٹن کے ایک دوست نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ بالڈون اور چمبرلین دونوں ایک سے ہیں اور دونوں کو

اس جرم میں کیڑنا چاہئے کہ انھوں نے سلطنت برطانیہ کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔

جب ہٹلر نے دول یورپ کی کمزور پالیسی سے فائدہ اٹھا کر رفتہ رفتہ اپنے آپ کو مضبوط کر لیا تو جنوری ۱۹۱۸ء سے ستمبر ۱۹۱۸ء تک اس نے پانچ اقدامات کئے

ہٹلر کے ابتدائی اقدامات

ایک سار کے علاقہ میں، دوسرا رائن لینڈ میں، تیسرا اسپین میں، چوتھا آسٹریا اور پانچواں سوڈٹین لینڈ کی طرف۔

بعض علاقوں میں ان اقدامات کا اندر یہ پیش کیا گیا کہ یہاں کی جرمن آبادی کو اصولاً رائش سے وابستہ ہونا چاہئے۔

بعض جگہ جرمنی زمین کی حفاظت کا عذر پیش کیا گیا اور کہیں یہ کہ بالشویت کا مقابلہ ہے۔

معاهدہ ورسائی کی رو سے جنوری ۱۹۱۸ء میں سار کے لوگوں کی رائے طلب کی گئی کہ وہ جرمنی میں شامل ہونا چاہتے

سار ہیں یا نہیں اور کثرت رائے سے فیصلہ کیا گیا کہ اس علاقہ کو جرمنی میں شامل ہونا چاہئے جو بالکل حق بہ جانب تھا لیکن

رائن لینڈ میں کیا ہوا۔ یہ داستان سننے کے قابل ہے

رائن لینڈ عہد نامہ ورسائی کی رو سے طے پایا تھا کہ رھائن لینڈ پر پندرہ سال تک برطانیہ، فرانس اور بلجیم کی فوجوں کا قبضہ رہے گا اور اگر جرمنی نے صلح نامہ کے معاہدات کی پابندی نہ کی تو اس سے بھی زیادہ عرصہ تک اس

پھر اس علاقہ کو ہمیشہ کے لئے غیر مسلح کر دیا جائے گا جسے ۱۹۱۸ء میں معاهدہ لوکارنو کے مطابق جرمنی نے بھی تسلیم کر لیا تھا۔

چنانچہ جون ۱۹۱۸ء ہی میں (پندرہ سال ختم ہونے سے پہلے ہی) تمام فوجیں یہاں سے چلی گئیں۔ جب ۱۹۱۹ء

میں ہٹلر برسر عروج ہوا تو اس تخلیق کو تین سال کا زمانہ گزر چکا تھا، لیکن بالکل خاموش رہا اور ہمیشہ یہی کہا کہ وہ معاهدہ

لوکارنو توڑنا پسند نہیں کرتا۔ جب ۱۹۲۰ء کو فرانس اور سوویٹ حکومت کے درمیان معاهدہ اتحاد ہوا، تو ہٹلر نے

اس وقت بھی کچھ نہیں کہا، حالانکہ اصولاً وہ اس کے خلاف احتجاج کر سکتا تھا۔ ۲۱ مئی کو ریشٹاگ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

”جرمن حکومت معاهدہ لوکارنو کی لفظ بلفظ پابندی کرے گی اگر دوسری حکومتوں نے بھی اس کا لحاظ کیا۔“

یہ نہایت ہلکا سا اشارہ تھا اس بات کی طرف کہ فرانس نے سوویٹ حکومت سے اتحاد کر کے معاہدہ لوکارنو کی خلافت ورز می کی ہے، لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا، بلکہ آسٹریا کی بابت بھی اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس پر قبضہ کرنا نہیں چاہتا۔ مگر یہ وہ وقت تھا جب اطالوی فوجیں آسٹریا کی سرحد پر مجتمع تھیں اور آسٹریا (Austria) کے محاذ پر فرانس و برطانیہ کی فوجوں کا اجتماع کیا جاتا تھا۔

اس کے دس ماہ بعد جب فرانس و برطانیہ کی فوجیں اٹلی کے حملہ حبشہ کے سلسلے میں نام نہاد دنا کہ بندی کی غرض سے ہٹالی گئیں اور برطانیہ و اطالیہ کے تعلقات بھی ناخوشگوار ہو گئے تو مارچ ۱۹۱۷ء کو ہٹلر نے رہائن لینڈ پر قبضہ کر لیا اور یہاں یہ پیش کیا کہ فرانس پہلے ہی سوویٹ حکومت سے اتحاد پیدا کر کے عہد نامہ لوکارنو کی خلافت ورز می کو چکا تھا اس لئے اب وہ بھی اس کی پابندی نہیں کرتا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یقین دلایا کہ وہ یورپ کے امن و سکون کو تباہ کرنا نہیں چاہتا اور نہ کسی دوسرے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ برطانیہ کے امن پسند لوگ یہ سن کر خوش ہو گئے اور انھوں نے کہنا شروع کیا کہ رہائن لینڈ پر اگر جرمنی نے قبضہ کر لیا تو کیا گناہ کیا۔ کیا یہ اس کا علاقہ نہ تھا اور کیا یہ مناسب تھا کہ اسے واپس نہ دیا جاتا۔ ہٹلر سمجھتا تھا کہ قبضہ رہائن لینڈ پر ضرور کوئی نہ کوئی جھگڑا پیدا ہوگا، لیکن جب اس نے فوراً ہی وہاں کی قلعہ بندی شروع کر دی اور اٹلی کو اپنی طرف مائل کر کے روم برلن محور (Rome Berlin axis) قائم کر لیا اور ایک نئے زاویہ سے اس نے فرانس و انگلستان پر دباؤ ڈالنے کی تدبیر شروع کر دی۔

فرانس اور سوویٹ اتحاد کے مسئلہ میں اس سے کہا گیا کہ اگر وہ چاہے تو بین الاقوامی عدالت کے ذریعہ سے اس امر کا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ فرانس اور سوویٹ حکومت کا یہ اتحاد حسب معاہدہ لوکارنو درست ہے یا نہیں، لیکن ہٹلر نے جواب دیا کہ ”جرمنی کسی بین الاقوامی عدالت کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کرنا نہیں چاہتا۔“

۱۹۱۷ء کے موسم گرما میں اسپین کے اندر خانہ جنگی رونما ہوئی اور ہٹلر و مسولینی دونوں نے باغی جماعت کی مدد کی **اسپین** روس نے وہاں کی اصل جمہوری حکومت کا ساتھ دیا لیکن بہت دے دے۔ فرانس و برطانیہ نے کوئی دخل نہیں دیا اس ڈر سے کہ کہیں دوسری جنگ عظیم نہ پھرا جائے۔

فرانس و برطانیہ نے اس باب میں اتنی احتیاط سے کام لیا کہ اپنے یہاں سے اسلحہ وغیرہ کی برآمد بھی روک دی حالانکہ یہ کوئی ناجائز فعل نہ تھا اور نہ اس سے جنگ عظیم برپا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

ہٹلر و مسولینی اپنی داخلت کے لئے یہ بہانہ پیش کر رہے تھے کہ وہ جنرل فرانکو کو مدد دیکر گویا ”بالشویت“ سے جنگ کر رہے ہیں حالانکہ اس وقت روس کے ساتھ حکومت اسپین کے سیاسی تعلقات بالکل نہ پائے جاتے تھے اور برطانوی مدیرین یہ سن کر خوش ہو رہے تھے کہ ”اچھا ہے، بالشویت کے خلاف کسی کو جنگ کرنے کی توفیق تو یہ“۔ اسپین میں خانہ جنگی ڈھائی سال تک جاری رہی اور جنرل فرانکو کی کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس تین طرف گھر گیا۔

اور اس کا شمالی افریقہ کا بحری راستہ بھی خطرناک ہو گیا، اسی کے ساتھ برطانیہ کے لئے بحرِ روم میں کافی خطرات پیدا ہو گئے اور اشتراکیت کے خلاف لٹی، جرمنی اور جاپان میں جو معاہدہ ہوا تھا وہ اب برطانیہ، فرانس اور جمہوریت کے خلاف استعمال ہونے لگا۔ اسپین کی خانہ جنگی کے دوران میں ہٹلر نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ وہاں کی جمہوری حکومت اور فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر دے اور جب اسپین کے ایک ہوائی جہاز نے غلطی سے جرمنی کے جنگی جہاز پر بم گرایا تو یہ خیال اور قوی ہو گیا، لیکن خیر یہ بات ٹل گئی۔

اس وقت برطانیہ کی پالیسی یہی تھی کہ ہٹلر کو مشتعل ہونے کا موقع نہ دیا جائے یہاں تک کہ جب زیکو سلویو کیا پر ہٹلر نے حملہ کا ارادہ کیا تو اس وقت بھی، مسٹر چمبرلین نے برطانوی بیڑوں کی نقل و حرکت کی اجازت نہیں دی۔ الغرض ۱۹۱۴ء کے اخیر تک لندن میں ایک عام خیال یہی موجزن تھا کہ جرمنی کے ساتھ رعایت و مروت سے کام لیا جائے اور اسکو جنگ پر آمادہ نہ ہونے دیا جائے۔ یہاں تک کہ برطانیہ افریقہ کی بعض نوآبادیاں بھی کچھ اور اضافہ کے ساتھ جرمنی کو واپس دینے کے لئے طیار تھا۔

آسٹریا اُس طرف برطانیہ کی یہ صلح کل پالیسی کام کر رہی تھی اور ادھر ہٹلر وسطِ یورپ کا آئندہ نقشہ طیار کر رہا تھا۔ اس نے ۱۱ جولائی ۱۹۱۴ء کو آسٹریا سے معاہدہ کر کے اس کی حکومت کو تسلیم کیا، پھر ۱۲ فروری ۱۹۱۴ء کو اس کی توثیق بھی کی لیکن ۱۰ مارچ ۱۹۱۴ء کی صبح کو اپنی فوجیں آتار کر خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر قبضہ کر لیا۔ بہانہ یہ تھا کہ آسٹریا کا چانسلر اس فکر میں تھا کہ اُسے جرمنی سے بالکل علیحدہ کر کے خود مختار بنائے۔ اس واقعہ کو بھی برطانوی امن پسندوں نے دیکھا اور کہا کہ ”آسٹریا میں چونکہ جرمن آبادی ہے، اس لئے جرمن حکومت سے اس کا علیحدہ رہنا کوئی معنی نہ رکھتا تھا، اور جو کچھ ہوا ٹھیک ہوا۔“

روسی حکومت نے جو سمجھتی تھی کہ اب زیکو سلویو کیا کی باری ہے، البتہ اس کو پسند نہیں کیا اور ایک کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کی تاکہ تمام بڑی چھوٹی قوتیں ملکر آئندہ اس قسم کے جرمنی اقدامات کو روک دیں۔ لیکن برطانیہ نے اس تحریک کی مخالفت کی اور مسٹر چمبرلین نے کہا کہ ”سوویت حکومت کی اس تجویز پر عمل کرنا ایک ایسے خطرہ کے متعلق عملی قدم اٹھانا ہی جو ابھی پیدا نہیں ہوا۔“

قبضہ آسٹریا کے بعد زیکو سلویو کیا چاروں طرف جرمن حکومت سے گھر گیا تھا لیکن ہٹلر برابر اسے بھلا دے میں ڈالے ہوئے تھا اور اس کی دوستی کا دم بھر رہا تھا، چنانچہ ۱۴ مارچ ۱۹۱۴ء کو مسٹر چمبرلین نے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

”مجھے فیلڈ مارشل گوئرنگ نے اطلاع دی ہے کہ جرمنی، زیکو سلویو کیا سے بگاڑنا پسند نہیں کرتا اور معاہدہ اتحاد کا پورا احترام کرتا ہے۔“

لیکن جب چھ مہینے کے بعد زیکیو سلیوکیا کے حصے بخرے کئے جانے کی تجویز پر اس نے اس معاہدہ اتحاد کی طرف برطانیہ و فرانس کو توجہ دلائی تو انھوں نے اس کو تصنیع اوقات سمجھا۔

۳۰ مارچ اور ۲۱ مئی ۱۹۳۸ء کو ہٹلر زیکیو سلیوکیا پر حملہ کر ہی دیتا اگر سرحد پر زکیو فوجوں کا اجتماع نہ ہو گیا ہوتا اور فرانس و برطانیہ کی طرف سے تینہی نوٹ نہ پہنچ گیا تھا۔ لیکن اندرونی طور پر جو صورت حال تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ۱۰ مئی کو ایک دعوت کی تقریب میں مسٹر چمبرلین کہ چکے تھے کہ ”فرانس، برطانیہ اور روس، زیکیو سلیوکیا کی طرف سے نہیں لڑ سکتے کیونکہ اس کی موجودہ جغرافیائی حیثیت کسی طرح باقی نہیں رہ سکتی اور اس پر نظر ثانی ضروری ہے“

رین ٹراپ، ہٹلر سے کہا کرتا تھا کہ میرے تعلقات اکابر برطانیہ سے اس بات کی ضمانت ہیں کہ وہ زیکیو سلیوکیا کی مدد نہ کریں گے، اس لئے ظاہر ہے کہ جب مسٹر چمبرلین کی یہ تقریر اس نے اخبارات میں دیکھی ہوگی تو اس کو رین ٹراپ کی باتوں کا اور زیادہ یقین ہو گیا ہوگا۔

اس کے بعد گرمی کا زمانہ جوں جوں ختم ہوتا گیا ”سوڈٹن لینڈ“ میں انقلابی جذبات کو زیادہ ابھارا گیا اور سوڈٹن کے لیڈروں نے زکیو حکومت کی تمام تجاویز کو یکے بعد دیگرے مسترد کر دیا، یہاں تک کہ جرمن افواج زکیوستان کی سرحد پر جمع ہونے لگیں۔ جب حالات اس قدر نازک ہو گئے تو مسٹر چمبرلین تین بار ہوائی جہاز پر سوار ہو کر ہٹلر سے ملنے گئے، پہلی مرتبہ (Benches garden) میں دوسری مرتبہ (Garden) میں اور آخری مرتبہ میونخ (Munich) میں۔ ہر چند بائیس بازو نے دوبار اصرار کیا کہ پارلیمنٹ کا جلسہ طلب کیا جائے اور اس سے مشورہ لیا جائے، لیکن چمبرلین نے انکار کر دیا اور یہ جلسہ طلب کیا بھی تو اس وقت جب وہ میونخ کو روانہ ہونے والے تھے۔ اس کے بعد ۳ اکتوبر کو پارلیمنٹ میں چار دن تک گفتگو ہوتی رہی لیکن بیکار کیونکہ معاہدہ میونخ کی غلطی ہو چکی تھی اور اس کا علاج ممکن نہ تھا۔

مسٹر چمبرلین سیاست خارجہ کا زیادہ تجربہ نہ رکھتے تھے اور ان کے مشیر بھی نا تجربہ کار تھے۔ چنانچہ جب پہلی مرتبہ وہ ہٹلر سے ملنے گئے تو نہ فارن سکریٹری کو ساتھ لے گئے اور نہ کسی مترجم کو۔ وہ خود جرمن زبان جانتے نہیں اس لئے انھیں صرف اس مترجم پر بھروسہ کرنا پڑا جو ہٹلر کی طرف سے متعین کیا گیا تھا۔

لیبر پارٹی کی پالیسی بالکل کھلی ہوئی تھی اور اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جرمنی کے خلاف فرانس، برطانیہ اور روس کو متحد ہو جانا چاہئے اور زیکیو سلیوکیا کی طرف بڑھنے سے جرمن کو قطعاً روک دینا چاہئے کیونکہ اب ہٹلر کے ارادے بالکل واضح ہو چکے ہیں، لیکن مسٹر چمبرلین نے اس کی پرواہ نہ کی۔

جب چمبرلین، ہٹلر سے ملکر پہلی مرتبہ واپس ہوئے تو وہ بہت خوش تھے اور ہٹلر کے وعدوں پر انھیں پورا بھروسہ تھا لیکن اس سے زیادہ غلطی برطانوی وزارت نے روس کے ساتھ معاملہ کرنے میں کی۔

چونکہ زکستان میں ایک کروڑ سلاfi آبادی پائی جاتی ہے اس لئے روس کو قدرتا اس مسئلہ میں دلچسپی لینا چاہئے تھی، لیکن میونخ میں اس کے نمایندہ کو صرف اس لئے نہیں بلایا گیا کہ ہٹلر اور مسوینی اس کو پسند نہ کریں گے۔ درانحالیکہ پراٹویٹ طور پر یہ معلوم ہو چکا تھا کہ زکستان کے باب میں وہ فرانس کے ساتھ جرمنی کے خلاف جنگ کرنے پر پوری طرح آمادہ ہے۔ اسی کے ساتھ ایک اور تماشہ کی بات یہ ہوئی کہ میونخ کانفرنس میں زکستان کا بھی کوئی نمایندہ طلب نہیں کیا گیا حالانکہ اسکے حصے بخرے لئے جارہے تھے۔

ہٹلر کی اول ملاقات کے بعد فرانس و برطانیہ کی طرف سے زرکی حکومت کو اطلاع دی گئی کہ جن مقامات میں ۵۰ فیصدی سے زیادہ آبادی جرمنوں کی ہے وہ فوراً جرمنی کے حوالہ کردئے جائیں۔ اس کا زرکی حکومت نے نہایت معقول جواب دیا کہ اس معاملہ کو اس معاہدہ کی رو سے طے کیا جائے جو جرمنی اور زرکی حکومت کے درمیان ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا اور جس کی تصدیق مارچ ۱۹۳۸ء میں بھی ہٹلر نے کی تھی۔ لیکن ۲۱ ستمبر ۱۹۳۸ء کے وقت دفعتاً اتحادی وزراء وہاں پہنچے اور کہا کہ اگر زرکی حکومت نے انکی تجویز پر عمل نہ کیا تو نتیجہ کی ذمہ دار وہ خود ہوگی اور اتحادی اس کی مدد نہ کریں گے۔ آخر کار اسی دن سہ پہر کو زرکی حکومت نے اتحادی تجاویز تسلیم کر لئے۔

لیکن ہٹلر نے اس کے بعد اپنے شرائط اور زیادہ سخت کر کے الٹی میٹم دیدیا۔ اتحادیوں نے ان شرائط کے ماننے سے یونتوانکار کر دیا اور فوجی اجتماع ہونے لگا۔ لیکن جب جمہرلین اور ڈیڈے (فرانس کے وزیراعظم) میونخ گئے تو جرمنی کے ان تمام شرائط کو تسلیم کر آئے جو فی الحقیقت پہلی شرطوں سے بھی زیادہ سخت تھیں اور مسٹر جمہرلین نے ۲۸ ستمبر کو دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ”ہٹلر نے مجھے یقین دلایا ہے کہ زکستان کے بعد وہ اب کسی اور ملک کی طرف اقدام نہ کرے گا اور میں اس کے وعدہ پر بھروسہ کرتا ہوں۔“

کہا جاتا ہے کہ اگر اسوقت اتحادیوں مضبوطی و پامردی سے کام لیتے تو ہٹلر دب جاتا اور کبھی زکستان پر حملہ نہ کرتا، لیکن مسٹر جمہرلین کی امن پسند پالیسی نے ہٹلر کی دھونس میں آکر موجودہ جنگ کی تباہی میں مبتلا کر دیا، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ جسوقت مسٹر جمہرلین میونخ سے واپس گئے تو برن ٹراپ نے ہٹلر سے کہا کہ ”آج اس بڑھے نے برطانوی حکومت کی موت کے کاغذ پر دستخط کر دئے اور تاریخ متعین کرنا ہمارے لئے چھوڑ دیا ہے۔“

لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ ہٹلر اتحادیوں کی بات نہ مانتا اور زکستان کے لئے لڑ بیٹھتا تو بھی ۱۹۳۸ء اس جنگ کے لئے زیادہ موزوں تھا اور ۱۹۳۹ء میں حالات اتحادیوں کے لئے بہت ناموافق ہو گئے تھے۔

ستمبر ۱۹۳۸ء میں اٹلی کا کوئی ارادہ نہ تھا کہ وہ جرمنی کا ساتھ دے اور اسی لئے اس نے فوجی طیاریاں بالکل کی تھیں، لیکن ۱۹۳۹ء میں اس کی مدد بھی ہٹلر کو مل گئی۔

۱۹۳۸ء میں زکستان کی تمام فوج اور اس کی قلعہ بندیاں اور وہاں کے اسلحہ سازی کے جملہ کارخانے اتحادیوں

کی مدد کے لئے موجود تھے، لیکن ۱۹۳۷ء میں زکیستان پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے تمام ذرائع ہتھیار کے ہاتھ آگئے تھے جن سے نازی افواج کو بڑی تقویت حاصل ہو گئی تھی۔

۱۹۳۷ء میں اتحادیوں کو روسی اور اد بھی مل سکتی تھی، لیکن ۱۹۳۷ء میں روس کا میلان جرمنی کی طرف ہو گیا۔ ۱۹۳۷ء میں پولینڈ کی مدد بھی حاصل ہو سکتی تھی، کیونکہ روس اس کو جرمنی کی طرف مائل ہونے سے روک سکتا تھا، لیکن ۱۹۳۷ء میں روس کے طرز عمل سے یہ حالات بالکل بدل گئے اور پولینڈ خود عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ ۱۹۳۷ء میں اس کا بھی امکان تھا کہ بلقان کی اکثر ریاستیں بجائے غیر جانبدار رہنے کے اتحادیوں کا ساتھ دینے پر مائل ہو جاتیں، لیکن ۱۹۳۷ء میں یہ اخلاقی مدد بھی اتحادیوں کو حاصل نہ ہو سکی۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ اگر زکیستان کی حمایت میں اتحادیوں اٹھ بیٹھتے اور یہ جنگ ۱۹۳۷ء ہی میں شروع ہو جاتی تو نازی کامیابی دشوار تھی، لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ اس وقت اتحادیوں کی ہوائی طاقت نسبتاً کم تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک حد تک یہ عذر معقول ہو، لیکن اب سے دو سال قبل جرمنی کی ہوائی طاقت بھی اتنی قوی نہ تھی، علاوہ اس کے سیلفرڈیلائن اتنی کمزور تھی کہ وہ فرانسیسی حملہ کو کسی طرح نہ روک سکتی تھی۔

اس باب میں مسٹر حیریل کا نقطہ نظر شروع ہی سے چمبرلین کے زاویہ نگاہ سے مختلف رہا ہے۔ چنانچہ ۹ دسمبر ۱۹۳۷ء کو اپنی تقریر کے دوران میں انھوں نے ہتھیار کی جارحانہ پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ اس کے ساتھ جس نرخی کا سلوک کیا گیا وہ ہرگز اس کا مستحق نہ تھا اور اس کے کسی وعدہ پر اعتبار نہ کرنا چاہئے تھا۔

(باقی)

طلسم عمل

اُردو زبان میں پہلی کتاب جس میں ”نفسیات“ کے اس راز کو کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ ایک انسان کیونکر کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے۔ یہ ترجمہ ہے مسٹر ڈیل کارینیگی کی اس مشہور کتاب کا جو شائع ہوتے ہی لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو گئی۔ ترجمہ اس قدر سلیس و سادہ ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ مصنف نے اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ سے نفسیاتی حقائق کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ایک افسانہ کی دلچسپی اس میں پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب کو ایک بار شروع کرنا اسے ختم کر دینا ہے۔

مینجر نگار لکھنو

قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ آٹھ آنہ (پھر)

شہرت کا عام دربار

کل رات بڑی دیر تک نیند نہ آئی بیسیوں پہلو پرے جتنی خواب آور دعائیں یاد تھیں سب پڑھ ڈالیں مگر نیند نہ آتا تھا نہ آئی، آخر جب تنک گیا اور کوئی تدبیر سونے کی کارگزہ ہوئی تو کتاب دیکھنے کی ٹھانی کچھ تو اس خیال سے کہ بیکار پڑے رہنے سے کیا فائدہ اور کچھ اس خیال سے کہ حکیموں نے مطالعہ کتب کو خواب آور کہا ہے۔ سر ہانے کی الماری سے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر ایک کتاب نکالی، اور پاس ہی رکھے ہوئے برقی لیمپ کا بٹن دبا کر روشنی کر دی۔ کتاب پر نظر پڑی تو آزاد کی نیرنگ خیالی اور صنف جو کھولا تو وہ جہاں آزاد اپنے استاد ذوق کے لئے بقائے دوام کے دربار میں کرسی ڈھونڈ رہے تھے۔ میں بھی تماشا دیکھنے لگا، بقائے دوام کے دربار میں لوگوں کا اتنا بندھا ہوا تھا، اور آزاد انھیں قریب سے بٹھا رہے تھے۔ آخر وہ وقت آیا کہ نیمہ تحقیق سے بھر گیا اور پچھلی صف میں دو ایک کرسیاں خالی رہ گئیں۔ کچھ لوگوں نے آزاد کی محنت کے صلہ میں انھیں بھی ایک کرسی پر بٹھانا چاہا لیکن فوراً اعتراضات شروع ہوئی کسی نے کہا کہ اس نے "ایک عالم سے لڑائی مول لے رکھی ہے" کسی نے کہا کہ "ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے" وغیرہ وغیرہ غرض اس بڑبڑنگ میں آزاد کھسک گئے، کچھ دیر کے بعد جب ذرا سکون ہوا اور میں نے بقائے دوام کے دربار کی طرف نگاہ اٹھائی تو وہ خمیہ تھا، نہ وہ شہنائی کی آواز تھی اس کی جگہ ایک بڑا وسیع پنڈال برقی قلموں اور کاغذ کی جھنڈیوں سے آراستہ نظر آیا، پنڈال کے قریب ہی ایک جھیل تھی جس میں کچھ کشتیاں پڑی ہوئی تھیں اور ان پر سے بیڈ کی آواز آرہی تھی، پنڈال کے دروازے پر برقی قلموں سے "خوش آمدید" بنا ہوا لکھا تھا۔ اور کچھ حضرات مغربی لباس میں آنے والوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے کھڑے تھے، لیکن یہ عجیب بات دیکھنے میں آئی کہ ہر آنے والے سے اندر جانے کے لئے دعوت نامہ طلب کیا جاتا ہے اور جس شخص کے پاس کارڈ موجود نہیں ہوتا اس کی جیب کی تلاشی لی جاتی ہے اگر کچھ مال قابل قدر مل گیا، تو انھیں بھی ٹکٹ دیدیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص پنڈال میں داخل ہو جاتا ہے تو اس کا نام بذریعہ لاؤڈ اسپیکر مع اس کے چند کارناموں کے سنا دیا جاتا ہے اور وہ شخص اپنا ٹکٹ لئے لال ٹول کے ڈھکے ہوئے راستہ سے شاہ نشین تک جاتا ہے اور صدر کو انگریزی طریقہ سے سلام کرتا ہوا چبوترے کے دائیں یا بائیں جانب سے نکلتا ہوا مقررہ جگہ پر جو اس کے ٹکٹ میں لکھ دی جاتی ہے آکر بیٹھ جاتا ہے

مجھے یہ حیرت ہوئی کہ آخر یہ کہاں کا دربار ہے جو اس قسم کی انوکھی پابندیاں عاید ہیں، پنڈال کے دروازے کو پھر غور سے دیکھا تو سائین بورڈ میں وہی "بقائے دوام و شہرت عام کا دربار" جگمگا رہا تھا۔ دروازے پر جانے کی توہمت

نیٹری کیونکہ نہ تو دعوت نامہ پاس تھا اور نہ جیب میں پیسے البتہ ایک جگہ پنڈال کی قنات ذرا سی کھلی تھی اور روشنی باہر آرہی تھی۔ میں دبے پاؤں ادھر چلا گیا اور اندر جھانکنے لگا، دیکھتا کیا ہوں کہ شہ نشین پر بڑا لانا چوڑا ایرانی قالین بچھا ہوا ہے اس پر نہایت اعلیٰ درجہ کی میز بچھی ہوئی ہے جس پر کھواب کا میز پوش پڑا ہوا ہے اور اس کے تین کونوں پر "بقاسے دوام" شہرت عام اور محنت کا انجام" لکھا ہوا تھا۔ چوتھا کونہ چونکہ نظر سے غائب تھا اس لئے پڑھانہ جاسکا۔ میز پر ایک چھوٹا سا مانی کر دھون رکھا ہوا تھا۔ میز کے قریب ایک گڑگا جینی گدے دار کرسی رکھی ہوئی تھی۔ میں یہ سمجھا کہ کرسی پر جو شخص بیٹھتا ہے وہ آزاد کی تخلیق کردہ شہرت کی دیوی ہوگی لیکن بجائے اس کے کرسی پر ایک یونانی دیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ صدر کی پشت پر نہایت خوبصورت شیشے کی الماریاں تھیں جن میں مراکو کے چمڑے کی بنی ہوئی جلدیں تھیں جن پر سنہرے حروف میں کتابوں کے نام نقش تھے نفاست سے چینی ہوئی تھیں، مگر حاضرین جلسہ کی طرف جو نگاہ اٹھائی تو جتنے لوگ دورویہ کرسیوں پر بیٹھے تھے وہ سب قریب قریب وہی تھے جنہیں میں کچھ منٹ پہلے آزاد کے دربار میں دیکھ چکا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ تمام لوگ نیم مغربی لباس میں تھے، اس کے علاوہ ہر شخص کے سامنے ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر تواضع کے لئے سگریٹ ریگار، دیاسٹائی اور خاکستردان رکھے ہوئے تھے، میری سمجھ میں یہ معاملہ کچھ نہ آیا پنڈال کے اندر بیٹھنے والوں میں وہی اکبر، فیضی اور وہی ذوق و غالب، سب موجود تھے۔ لیکن دربار کی کایا پلٹ ہو گئی تھی، اس تہی کو سلجھانے کے لئے میں ذرا دیر کے لئے وہاں سے ہٹ آیا۔ لیکن اس خیال سے کہ کہیں کوئی اور شخص جسے میری طرح دربار میں جانے کی صورت نظر نہ آتی ہو یہاں قبضہ کر لے قنات درست کر دی تاکہ روشنی چھن کر باہر نہ آئے اور خود پنڈال کے چاروں طرف گھومنے لگا کہ ممکن ہے کوئی ایسا آدمی مل جائے جس سے یہاں کے حالات معلوم ہو سکیں، بڑی دیر تک گھومتا رہا لیکن کوئی ایسا نہ ملا جس سے کچھ حال معلوم ہوتا۔ ہر شخص بید مصروف نظر آتا تھا۔ قرینہ سے معلوم ہوا کہ بہت سے لوگ پنڈال میں جانے کے منتظر ہیں کچھ ایسے ہیں جن کے پاس ٹکٹ موجود ہیں مگر ان کا نمبر ابھی نہیں آیا ہے اور کچھ لوگ وہ ہیں جن کے پاس ٹکٹ نہیں ہے وہ اس کے حاصل کرنے کے انتظام میں ہیں اور اندر بیٹھنے والوں سے مدد لینے کا طریقہ سوچ رہے ہیں۔ غرض عجیب نفسی نفسی کا عالم ہے۔ میں نے کئی آدمیوں کو اپنی طرف متوجہ بھی کرنا چاہا مگر کسی نے نہ سنی۔ آخر بار کمر میں دروازے کی طرف چلا۔ ایک صاحب نے جو اتفاق سے میری طرف منہ کئے سگار سے دھواں نکال رہے تھے، مجھے غور سے دیکھا۔ مجھے معافی خیال گزرا کہ میری پریشاں حالی جاذب توجہ ہوئی۔ میں نے مغربی طریقہ سے سلام کیا اور ذرا ان سے قریب ہو گیا۔ انھوں نے سلام کا جواب بے کمر کہا۔ ابھی انٹرول (وقفہ) ہے زرا ٹھہر کر اندر جائیے گا۔ مگر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں اندر جانے والوں میں نہیں ہوں بلکہ ایک نووارد ہوں اور صرف اس اجتماع کا سبب معلوم کرنا چاہتا ہوں تو انھوں نے بتایا کہ یہ دربار عموماً ساڑھے ستر سال کے بعد منعقد ہوتا ہے لیکن ابھی یہ اس وجہ سے وقت سے پہلے منعقد ہو رہا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ جنہیں شہرت دوام کی سند حاصل ہونا چاہئے تھی مہتمم دربار (رجسٹرار) کی غفلت اور ذاتی اغراض کی بنا پر نہ مل سکی اور پچھلے کس میری کی

حالت میں پڑے ہوئے ہیں میرے استفسار پر اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ لوگ جو دروازے پر کھڑے ہیں موجودہ دور کے نقاد ہیں اور مغربی اصول تنقید سے واقف ہیں اور بقائے دوام کے دربار میں جانے کی اسی کو اجازت دیتے ہیں جو ان کے معیار پر صحیح اُترتا ہے۔ اس نے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ جتنے لوگ تم کو نظر آرہے ہیں وہ ہیں جن کو اس سے قبل کے دربار میں سند مل چکی تھی مگر ان نقادوں نے زبردستی ان کی جانچ پر تال کر کے ان سندوں کی تصدیق مزید کر کے دعوت ناموں کے ساتھ انھیں شریک مجلس کیا ہے۔ جو نئے آنے والے ہیں ان کی البتہ خوب جانچ کی جاتی ہے تب کہیں ان کو اجازت دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کے درجے بھی مقرر کر دئے جاتے ہیں۔ لیکن اندر پہونچنے پر اور رائے عامہ کے ذریعہ درجہ بدل بھی جاتا ہے۔

میں نے ”فرشتہ امداد“ کا شکریہ ادا کیا اور پھر گھر متا ہوا قنات کے پاس آگیا اور آہستہ سے قنات کھسکا دی۔ چونکہ جلسہ کی پوری کارروائی دیکھنے کا ارادہ تھا اس لئے جیب سے رومال نکال کر گھاس پر بچھا دیا اور ملتچی مار کر بیٹھ گیا۔ چند ہی سکنڈ کے بعد لاؤڈ اسپیکر سے آواز آئی ”دنیاۓ مرتیہ کا تاجدار انیس“ ساتھ ہی میرا انیس مراٹھی کی تین ضخیم جلدیں نظامی پریس کی چھپی ہوئی بغل میں دبائے نہایت متانت کے ساتھ صدر کی جانب بڑھے اور یہ ادب سلام کر کے کتابیں نذر گزرا انیس۔ صدر نے مسکراتے ہوئے انیس کا خیر مقدم کیا۔ فضائلیوں سے گونجی اور انیس، غالب، ذوق اور مومن کے بالمقابل جا کر بیٹھ گئے، تالیوں کی گونج کم ہوئی تو داغ دہلوی کی آمد کا اعلان ہوا۔ ان کا نام سنتے ہی ذوق کی باجھیں کھل گئیں۔ مگر غالب، مومن اور میر کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ مگر بولا کوئی نہیں۔ صرف ایک آواز ایک کونے سے سنائی دی یہ تو ارباب نشاط کے شاعر ہیں۔ یہاں کیسے؟ دوسری آواز آئی ہاں ہاں! خبردار شہر یار دکن کے استاد ہیں آنے دو۔ جس پر ذوق اور ظفر نے ان کی سفارش کی کہ جرات کے انداز کے واحد نمائندے ہیں انھیں ضرور جگہ ملنا چاہئے۔ صدر نے تسلیم کیا۔ داغ حیدر آبادی لباس میں آگے بڑھے چند چھوٹے بڑے محلے پیش کر کے جلدی سے ذوق کے پیچھے بیٹھ گئے۔ اب میر مینائی کی باری آئی۔ کسی نے کہا کہ داغ کی صحبت نے ان کو بھی خراب کما مگر جب انھوں نے اپنے ناتمام لغت کے اجزاء دکھائے تو انھیں بھی داغ کے پہلو بہ پہلو جگہ مل گئی، امیر مینائی نے بیٹھتے ہی صدر سے یہ درخواست کی کہ باہر مشہور مداح ہمیں محسن کا کوروی موجود ہیں جنھیں دربان داخل نہیں ہونے دیتے ہیں انھیں بھی آنے کی اجازت دیجائے، لغت میں ان کی مثال نا پیدا ہے صبر نے حاضرین سے رائے لی سب نے امیر کی تصدیق کی اور محسن مدحیہ ثنویوں اور چیتانوں کا مجموعہ لئے داخل ہوئے اور صدر کو کتاب نذر کر کے امیر مینائی کے پاس بیٹھ گئے۔

دفعۃً باہر ایک شور ہوا، معلوم ہوا کہ نثر اردو کے بابا آدم (بقول حالی) سر سید احمد خاں تشریف لارہے ہیں اور ان کے ساتھ ان کے دوست چراغ علی، محسن الملک اور وقار الملک انھیں پہونچانے آئے ہیں مگر سر سید تنہا نہیں آنا چاہتے ہیں اور انھیں ساتھ لانا چاہتے ہیں بڑی رد و کد کے بعد صدر نے انھیں بھی اجازت دی۔ سر سید

داخل ہوئے۔ کتابوں کے بوجھ سے دبے جا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ چل کر صدر کی میز پر ایک پورا پشاور جس میں آثار الصنادید تفسیر قرآن، اسباب بغاوت ہند اور تہذیب الاخلاق کے پرچے اور خطبات احمدیہ وغیرہ شامل تھیں ڈھیر کر دیا، فضا پھر تالیوں سے گونجی اور سرسید غالب کے بائیں بازو پر آکر بیٹھ گئے اور بقیہ لوگ سرسید کی پیچھے والی صف میں جا کر بیٹھ گئے ان کی طرف سے جو نظر پھری تو ڈاکٹر نذیر احمد سر پر قرآن شریف منجم رکھے اور اسی بغل میں مذہبی ناول دبائے جلدی جلدی قدم اٹھائے شہ نشین کے قریب آئے۔ آپ کا تعارف یہ کرایا گیا کہ آپ تعلیم نسواں کے حامیوں میں ہیں اور مشرقی اور مغربی معاشرتوں کے نقاد ہیں، اہل اللامتہ کے متعلق کچھ کا ناچھوسی بعض لوگوں میں ہوئی لیکن صدر تک بات نہیں پہنچی چنانچہ آپ کو سرسید کی پشت پر جگہ مل گئی۔

پھر پنڈال میں ایک زور کا دھکا لگا، ساتھ ہی زنجیروں کے سجنے کی آواز آئی اور لاؤڈ اسپیکر یہ کہتا ہوا سنائی دیا "ایک دیوانہ پیروں میں زنجیریں پہنے بہت سی کتابوں کے مسودے جن میں کچھ مکمل اور کچھ نامکمل ہیں ہاتھوں میں لئے زبردستی داخل ہونا چاہتا ہے منجملہ اور دعوؤں کے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ پچھلی مرتبہ بقائے دوام کا ہتھم دہی تھا اور اپنا نام آزاد بتاتا ہے، آزاد کا نام سنتے ہی اس سے قبل کہ صدر کچھ کہے اکبر بادشاہ نے اٹھکر شاہانہ انداز میں سفارش کی کہ اس نے میرے ان کارناموں کو زندہ کیا جو تین صدیوں کی مدت نے دلوں سے محو کر دیا تھا۔ اس کو ضرور جگہ ملنا چاہئے۔ اکبر کی دیکھا دیکھی ابو الفضل نے بھی زبان کھولی کہ اگرچہ اس نے میری آئین اکبری توڑ مڑ کر دربار اکبری پیش کی ہے لیکن چونکہ میری ولی نعمت کا نام پھر زندہ کیا ہے لہذا میں بھی سفارش کرتا ہوں، اب ذوق کی باری آئی جنھوں نے ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے۔ لیکن ظفر نے اٹھ کر کہا کہ وہ اس قابل نہیں کہ اس دربار میں جگہ پائے اس نے مجھ پر تہمت تراشی اس نے مری عمر بھر کی کمائی استاد ذوق کے حوالے کر دی، غالب اور مومن نے بھی اس کی تائید کی لیکن آزاد نے جتنے شعرا کو "آب حیات" پلا کر زندہ کیا تھا ان سب نے سفارش کی۔ آخر صدر نے یہ اجازت دی کہ وہ پابجولاں لایا جائے اور کرسی پر اس طرح بٹھایا جائے کہ بھاگ کر نہ گامہ نہ بپا کرے۔ آزاد کئی آدمیوں کی معیت میں داخل ہوئے۔ بہت اچھلے کودے اور اپنی کل کائنات در بغل میز پر پٹخ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایک زنجیر ان کی ذوق کے ہاتھ میں دیدی گئی اور دوسری ایک خالی کرسی میں باندھ دی گئی۔

ان سے فرصت ہوئی تو حالی پانی پتی کی آمد کی خبر مشہر ہوئی۔ ان کا نام سنتے ہی غالب اور سرسید مارے خوشی کے اپنی کرسیوں سے اچھل پڑے اور ذوق و آزاد نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ حالی نہایت خاموشی سے داخل ہوئے۔ چہرے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی شعر کی تنقید میں مصروف ہیں نظر نیچے کئے ہوئے سیدھے صدر کی طرف گئے مسدس حالی، یادگار غالب، حیات جاوید اور "مقدمہ شعر و شاعری" نذر کر کے واپس ہوئے اور غالب اور سرسید کو نہایت ادب سے سلام کیا۔ سرسید نے جھپٹ کر چٹا لیا اور اپنی کرسی کے برابر دوسری کرسی پر بٹھا لیا۔

اب علامہ شبلی نعمانی کی آمد آمد کا شور ہوا شبلی کا نام سنتے ہی جتنے ایرانی اور ہندوستانی دربار میں بیٹھے تھے سب شگفتہ ہو گئے، البتہ خانی خاں اور آزاد کے چہرے اتر گئے، سب نے شبلی زندہ باد کے نعروں سے ان کا خیر مقدم کیا۔ شبلی بیساکھی کی مدد سے آگے بڑھے سید پر مجید یہ تھکے لگائے، کتابوں کا تھیلہ پشت پر، ابھی صدر کی نشست تک نہ پہنچے پائے تھے کہ حضرت اورنگ زیب نے بڑھکر لپٹا لیا۔ پیشانی پر بوسہ دیا اور کچھ دعائیں پڑھ کر دم کیں۔ صدر نے بھی ہاتھ کی حرکت سے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کی کتابوں کا پورا سٹ نہایت احترام سے دونوں ہاتھوں میں لیکر اپنی میز کی داہنی جانب رکھ لیا، ہر شخص شبلی سے مصافحہ کرنے کے لئے بقیار تھا۔ شبلی فرداً فرداً ہر شخص سے مصافحہ کرنے کے بعد بہت دیر کے بعد سرسید کے قریب حالی کے مخالف سمت میں بیٹھ گئے۔ بہت دیر کے بعد جلسہ میں سکون ہوا۔

ان کے بعد شرر کی باری آئی۔ ان کے آنے پر بھلا کس کو اعتراض ہوتا۔ وہ آئے اور اس شان سے کہ نادلوں کا پوٹ ایک کندھے پر دگداز کے پرچے دوسرے ہاتھ میں، مکتب تاریخی بغل میں دابے۔ ایک ہاتھ میں "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" لئے مغربی لباس زیب تن اور اس پر ایک بڑی سفید ڈاڑھی۔ نہایت تہذیب صورت بنائے آہستہ آہستہ آ رہے تھے کہ کسی نے ٹوکا اپنے اہل بیت پر اتہام لگائے ایک آواز آئی آپ "پر وہ شکن" بھی ہیں۔ مگر کسی نے اثر نہیں لیا۔ لہذا صدر کو پوٹ کا پوٹ دیکر کسی بہتر جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ حالی نے اشارے سے بلایا اور وہیں جا کر بیٹھ گئے، ان کے بیٹھتے ہی قہقہوں کی آواز آئی۔ اور منشی سجاد حسین اڈیٹر ادھر بیچ کا نام پکارا گیا۔ حالی اور شرر دونوں کے چہرے سجاد حسین کا نام سنتے ہی اتر گئے اور کرسیوں پر جنبش کرنے لگے۔ آزاد بھی کھسکے، کچھ لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ کچھ مارے تہذیب کے ہونٹ چبا کر ہنسی روک رہے تھے، ادھر سجاد حسین ایک ہاتھ میں حاجی بخلول کا کارنامہ لئے اور بغل میں ادھر بیچ کے پرچے دبائے داخل ہوئے کہ پورا پنڈال قہقہستان بن گیا۔ حتیٰ کہ صدر کے ہونٹوں پر بھی ہلکا سا تبسم کھیلنے لگا۔ سجاد حسین نے آگے بڑھ کر حاجی بخلول کا صدر سے تعارف کرایا۔ پھر ادھر بیچ کے فائلوں سے میز پاٹ دی۔ واپس لوٹے تو کوئی جگہ پسند نہ آئی اور کرسی گھسیٹ سب سے الگ صدر کے چبوترے کے قریب نیچے بیٹھ گئے۔ سجاد حسین کے بیٹھتے ہی سرشار قہقہوں کے ساتھ داخل ہوئے سیر کہسار اور فرسانہ آزاد کی بڑی بڑی وزنی جلدیں پیش کر کے سجاد حسین کے پاس ڈرا پیچھے دب کر بیٹھ گئے۔

سرشار کے بیٹھتے ہی ایک بیک لڑکوں کا شور و غل سنائی دیا۔ معلوم ہوا کہ مدرسوں کے بچے بچیاں زبردستی اسماعیل میرٹھی کو پکڑ لائے ہیں وہ لاکھ دامن چھڑا کر بھاگتے ہیں لیکن لڑکے انھیں جانے نہیں دیتے اور صدر سے درخواست ہے کہ انھیں بھی ان کا نمائندہ سمجھ کر داخل کر لیا جائے۔ صدر نے رائے طلب کی۔ شیخ سعدی نے فوراً بچوں کی تائید کی اسماعیل آئے اور اپنا کلیات تذکرہ کے سعدی سے بہ پاس ادب ڈرا پیچھے ہٹ کر ان کے پاس بیٹھ گئے۔ اسماعیل کے بیٹھتے ہی پھر دور کا قہقہہ پڑا۔ معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم آبادی کے داخلے کا پیش فیہ ہے۔ کلیات کی

تین جلدیں بغل میں دابے ایک ہاتھ میں تسبیح لئے داخل ہوئے اور شہ نشین تک پہنچتے پہنچتے شبلی سرسید حالی اور شرر سب ہی سے ٹکر لیتے ہوئے آئے۔ البتہ سجاد حسین کو بڑے تپاک سے سلام کیا اور انھیں کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایسا معلوم ہوا کہ بہت سے اچھوت اور دیہاتی جیکارے لگاتے چلے آ رہے ہیں۔ دروازے کے قریب یہ شور رکھا اور اعلان کیا گیا کہ منشی پریم چند دیہاتی اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کے نمایندے بن کر آئے ہیں اور داخل دربار ہونا چاہتے ہیں۔ سب کو شوق ہوا کہ ان کی زیارت کریں۔ چنانچہ صدر کے ایما سے وہ بلائے گئے، منشی جی سوٹ میں ملبوس فلٹ کیپ سر پر دھرتے مختصر افسانوں اور ”میدانِ عمل“ کے خوبصورت کتابچے لئے ڈالس تک پہنچے۔ دہلی کو منسکار کر کے اپنی محنت کی بھینٹ چڑھائی، شہرت کا خلعت ملا۔ واپس آئے اور شرر سے زرا پیچھے کرسی سرکا کر بیٹھ گئے۔ انکے پیچھے آغا حشر کاشمیری اپنے ڈرائے لیکر داخل ہوئے۔ کالیداس نے بڑھکر ان کا خیر مقدم کیا۔ شرر۔ پریم چند اور سجاد حسین نے بھی مبارکباد دی، صدر کو ڈرائے نذر کر کے کالیداس کے پاس برابر بیٹھ گئے۔

اتنے میں ایک نجیٹ و زاہد بزرگ پستہ قد، سیاہ قام چار موٹی موٹی بڑی ضخامت کی جلدیں رعشہ دار ہاتھوں میں اٹھائے ڈلگاتے ہوئے آتے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ مولوی نور الحسن نیر مولف نور اللغات ہیں۔ امیر مینائی نے سہارا دیکر ڈالس تک پہنچایا۔ محسن نے اٹھکر پیشانی کو بوسہ دیا۔ ان کی محنت نظر استحسان سے دیکھی گئی اور انھیں امیر مینائی کے پاس ہی بگنل گئی۔

ایک بار پھر شور ہوا کہ ایک آزاد فقیر نظیر داخل مجلس ہونا چاہتے ہیں اور دو شخص مخمور اکبر آبادی اور نیاز فتحپوری کی سفارش لیکے آئے ہیں اور کچھ سفید نام مغربی لوگ بھی ان کے ہم زبان ہیں۔ ان کو شکایت ہے کہ گزشتہ دربار میں تم نے قصداً ان سے چشم پوشی کی۔ صدر نے آزاد کی طرف دیکھا۔ آزاد نے شرم سے گردن جھکالی۔ طلبی ہوئی۔ اس شان سے داخل ہوئے۔ ٹانگوں میں تھمد گئے میں کفنی بغل میں مرگ چھالا اور ہاتھ میں عصائے فقیری لئے کھڑاؤں پہنے، مسکراتے ہوئے صدر کے قریب پہنچے۔ ترقی عمر کی دعا دیکر مرگ چھالے۔ سے کلیات نظیر اکبر آبادی نکالی اور ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور تیر کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ لوگ انھیں بھی دیکھ کر جڑ بڑ ہوئے لیکن کسی کو دم مارنے کی جرات نہیں ہوئی۔ لوگ ابھی ان کے دیکھنے ہی میں مصروف تھے کہ شاعر مشرق کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ پوری مجلس سنبھل کر بیٹھ گئی۔

پردہ اٹھا اور ”شاعر مشرق“ علامہ اقبال پیام مشرق۔ بانگ درا، زیور عجم، ضرب کلیم، اور جاوید نامہ کے دیدہ زیب ایڈیشن لئے چہرے سے عمل، آزادی اور زیست کے آثار ہویدا، نہایت تکنت سے بڑھے۔ پورے جلسہ نے کھڑے ہو کر ان کا خیر مقدم کیا، چھت سے پھولوں اور پنکھڑیوں کی بارش ہونے لگی۔ سعدی، حافظ، خاقانی، فیضی، داغ، شبلی، اور غالب نے ہاتھوں ہاتھ صدر تک پہنچا دیا۔ ادب کی دیوی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ہوا میں رقص کئے زندہ جاوید شاعر کے اہبات لیکر سامنے رکھ لئے۔ اقبال پیچھے ہٹے۔ حافظ، سعدی اور فیضی نے اپنی طرف کھینچ لیا اور اپنی صف کے

آگے ایک کرسی بچھا کر اس پر بیٹھا دیا۔ اس کے بعد ایک پیر مرد ایک ہاتھ میں آنسوؤں کا مار لے اور دوسرے میں بڑی چھوٹی چند کتابیں لے سوگوار صورت بنائے آتے دکھائی دئے۔ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ راشدا خیری ہیں جو عورتوں کی دنیا کے بڑے ہمدردوں میں ہیں، صدر کو بھی ان سے دلچسپی ہوئی۔ نذر پیش کر کے شرر کے پاس بیٹھ گئے۔

ابھی کوئی اور نہ آنے پایا تھا کہ صدر نے اپنی نزم آواز میں کہا کہ ایک ادب کا پیاسا اگرچہ ابھی اس کی اہلیت نہیں رکھتا کہ باقاعدہ اس مجلس میں شامل ہو، کئی گھنٹے سے قنات کے پاس بیٹھا جلسہ کی کارروائی دیکھ رہا ہے اور اپنی ادب دوستی کا ثبوت دے رہا ہے لہذا ہم اسے بحیثیت مہمان کے شرکت مجلس کی دعوت دیتے ہیں جو لوگ صدر دروازے پر کھڑے ہیں اسے جا کر لے آئیں۔ میں نے جو اپنی طلبی کی بھنگ پائی جلدی سے کھڑا ہو گیا اتنے میں پیروں کی چاپ سنائی دی۔ تیزی سے جو گھوما تو آنکھ کھل گئی۔ لیمپ جل رہا تھا، کتاب نیچے پڑی تھی۔

سراج احمد علوی

ل۔ احمد صاحب کے افسانے

انشائے لطیف :- اردو ادب میں صاحب ”لالہ رخ“ کا نام محتاج تعارف نہیں اور افسانہ نویسی میں جو معیار ل۔ احمد صاحب نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ ان کا ہر افسانہ علم و حکمت، جذبات و ارادات اور نفسیات کی بولتی تصویر اور اردو ادب میں مستقل اضافہ ہوتا ہے یہ چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آپ کو اگر سلاست زبان کے ساتھ نفسیات شباب اور جذبات حسن و عشق کی صحیح نقاشی دیکھنا ہے اور ادب و شعریت کا ذوق ہے تو اس مجموعہ کو دیکھئے۔ پونے تین سو صفحات۔ قیمت مجلد عام نعمارت :- اس مجموعہ میں جناب ل۔ احمد صاحب کے ساٹھ مختصر ترین افسانے اور ادب پارے شامل ہیں جسے نشر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفریں کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔ اردو کی لطافت و نفاست کا اندازہ کرنے کے لئے اس انتخاب کا دیکھنا از بس ضروری ہے۔ ۱۳۶ صفحے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔

زندگی کے کھیل :- ل۔ احمد صاحب کی بارہ کہانیوں کا نیا مجموعہ ہے۔ جس میں معاشری خرابیوں اور فحاشی زدہ سماج کی زندہ تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ۵۰ صفحات قیمت مجلد ایک روپیہ۔

محبت کا افسانہ :- یہ ایک طویل افسانہ ہے جس میں ل۔ احمد صاحب نے مسرت از دواج سے بحث کی ہے لیکن اس غایت تصویر کے ساتھ ساتھ اس کا ہر باب ایک مستقل افسانہ ہے اور ہر باب میں معاشری و اخلاقی مسائل پر حکیمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ساڑھے تین سو صفحات قیمت مجلد دو روپیہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

کارگاہ قدرت میں عزم انسانی کی دلچسپ داستان

آپ کسی صاف دن میں آسمان کی طرف دیکھیں گے تو آپ کو سوائے نیلگوں فضا کے کچھ نظر نہ آئے گا، اسی طرح رات کو بیشمار تاروں کے علاوہ کچھ نہ دکھائی دے گا، اس لئے اگر ہمارے کرہ زمین کی کوئی چھت ہو سکتی ہے تو اسے اربوں میل کی بلندی پر ہونا چاہئے، لیکن آپ یہ سنکر تعجب کریں گے کہ ہماری دنیا کی چھت ہم سے صرف دس میل کی بلندی پر واقع ہے جسے علمی اصطلاح میں فضا کے قائمہ (Satellite) کہتے ہیں۔

ہم اسے چھت کیوں کہتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ ہمیں شدید گرمی اور سردی سے محفوظ رکھتی ہے، ٹوٹنے والے ستاروں کی زد سے بچاتی رہتی ہے اور اس فہلک برقی رو کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے جو فضا میں پیدا ہو کر زمین کی طرف آتی ہے اور جسے اصطلاح میں (Cosmic Radiation) کہتے ہیں۔

نصف صدی قبل انسان کو اس چھت کا حال بالکل معلوم نہ تھا، اور اب بھی پوری طرح اس کا علم حاصل نہیں ہوا لیکن جو کچھ معلوم ہو سکا وہ یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ آئندہ تحقیقات ہمارے ان نظریوں میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دے گی جو کائنات کے متعلق ہم نے قائم کئے ہیں۔

بیسویں صدی کی آغاز تک زمین کے بہت سے حصے ایسے تھے جہاں انسان کا گزر نہ ہوا تھا، لیکن اس صدی کے اختتام پر رائٹ (L. V. Wright) نامے دو بھائیوں نے ہوا میں اڑنے والی مشین بنائی اور اس کے بعد ہوائی جہاز طیارے کئے گئے جو ایورسٹ پہاڑ کی چوٹی پر اڑے، جنہوں نے دریائے امیزن (Amazon) کے ناقابل گزر جنگلوں کی تصویریں لیں اور قطبین کے برف پوش حصوں کے نقشے طیارے کئے۔ اس سلسلہ میں لوگوں نے زمین کے اندر اور سمندر کے نیچے بھی پہنچنے کی کوشش کی، لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ زمین کے اندر ہر دو سو فٹ کی گہرائی پر ایک ڈگری حرارت بڑھ جاتی ہے اور ۱۰۰۰ فٹ کی گہرائی میں گرمی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سمندر کے اندر نصف میل سے زیادہ کا حال نہ معلوم ہو سکا۔

جب انسان کو زمین اور سمندر کی گہرائیوں کی طرف سے مایوسی پیدا ہوئی، تو اس نے فضا کی جستجو شروع کی جسے ۱۹۴۹ء سے شروع ہوتی ہے اور آج کی صحبت میں اسی کی داستان آپ کو سنانا ہے۔

۱۹۴۹ء میں اسکی ابتدائیوں ہوتی ہے کہ ڈاکٹر الکزنڈر ہلسن (Dr. A. L. H. H.) نے تھرمائٹر باندھ کر

۱۹۹۹ء اور ۱۹۹۲ء کے درمیان ڈی پورٹ (De Bort) سیکڑوں غبارے تھرامیٹر رکھ کر اوپر اڑائے اور اس تجربے سے یہ نتیجہ نکلا کہ چھ یا سات میل کی بلندی پر جو درجہ حرارت پایا جاتا ہے، وہ قائم رہتا ہے یعنی اس کے اوپر آپ جتنا چاہیں چلے جائیں پارہ نقطہ انجماد سے وہی ۵۵ درجے نیچے رہے گا، زیادہ نہ گرے گا۔ بعد کو مزید تجربات کئے گئے اور پتہ چلا کہ فضا کا وہ حصہ جو زمین سے چھ سات میل کی بلندی پر ہے اور جس کا درجہ حرارت یکساں رہتا ہے ۲۵ میل کی موٹی تہ میں زمین کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، اور اس کا نام انھوں نے فضا کے قائمہ (Space Layer) رکھا۔ اس ۲۵ میل کی تہ اور کرۂ زمین کی اُس فضا کے درمیان جس میں ہم سانس لیتے ہیں ایک اور فضا پانچ، چھ میل کی پائی جاتی ہے اور اس کا نام انھوں نے (Space Layer) رکھا جسے ہم فضا کے حارہ کہہ سکتے ہیں، اس فضا کے بعد ہماری زمین کی فضا شروع ہوتی ہے جس کی تہ دو میل کی ہے اور اسے اصطلاح میں (Space Layer) یا "فضائے ارضی" کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان تجربات سے فضا کی تین تہیں دریافت ہوئیں، ایک فضا ارضی دو میل کی، دوسری فضا حارہ، ۶، ۷ میل کی اور تیسری فضا قائمہ ۲۵ میل کی اور یہ خیال کہ فضا ایک ہی ہے غلط نکلا۔ اس جگہ یہ ظاہر کر دینا مناسب ہوگا کہ فضا کے قائمہ کی حد ایک ہی فاصلہ سے شروع ہوتی ہے اور "منطقہ معتدلہ" پر کم فاصلہ سے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے آپ ابر کے غبارہ کو بھلائیں کہ درمیان میں وہ زیادہ اُبھرا ہوا ہوگا اور کناروں پر کم۔ اسی کے ساتھ یہ بھی جان لینا چاہئے کہ فضا قائمہ کا ٹمپرچر جگہ ایک نہیں ہے۔ یعنی اس کا ٹمپرچر زیادہ گھٹتا بڑھتا تو نہیں ہے، لیکن مختلف حصوں کا ٹمپرچر مختلف ہوتا ہے مثلاً قطبین کے سامنے فضا کے قائمہ کا ٹمپرچر ۶۱ سے ۶۴ درجے تک صفر سے نیچے رہتا ہے اور خط استوا پر ۵۲ درجے نیچے۔ فضا کے قائمہ میں کُہر یا بادل تو نہیں پائے جاتے لیکن ہوا کے طوفانوں کا وہاں ضرور اندیشہ ہے، اس لئے ہوائی جہازوں کا اس فضا کو عبور کر کے اور زیادہ بلندی پر چلا جانا آسان نہیں۔

فضائے قائمہ کی سب سے زیادہ عجیب چیز وہ ہے جسے "فضائی شعاعیں" (Cosmic Rays) کہتے ہیں اور انھیں کی تحقیقات کرنے کے لئے ڈاکٹر آگسٹ پکارڈ (August Piccard) نے فضا کے قائمہ میں پہنچنے کی کوشش کی تھی۔

یہ شعاعیں کہاں سے آتی ہیں؟ اس کے متعلق صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ وہ "فضائے قائمہ" سے بہت دور کسی اور جگہ سے آتی ہیں اور اُن کی قوت نفوذ اتنی زبردست ہے کہ وہ فضاؤں کو چیر بھار کر صرف زمین ہی تک نہیں پہنچتیں بلکہ زمین کے اندر اور سمندر کی تہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ وہ ہر وقت ہمارے جسموں کے اندر سے بھی گزرتی رہتی ہیں لیکن چونکہ فضا کے قائمہ اور فضا کے حارہ سے چھن کر آتی ہیں اس لئے بہت کمزور ہو جاتی ہیں، ورنہ ہم ایک لمحہ زندہ نہ رہ سکیں ان شعاعوں کی قوت نفوذ اتنی زبردست ہے کہ اگر ہم زمین کو سیسہ کی ۳۴ فٹ موٹی چادر میں لپیٹ دیں تو شاید یہ

شعاعیں نہ آسکیں ورنہ اور کوئی صورت ان کو روکنے کی نہیں ہے۔

جس وقت ان شعاعوں کے متعلق جستجو کا خیال پیدا ہوا تو یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ ان کا صحیح حال ہم کو اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب ہم فضا کے قائمہ میں پہنچ جائیں اور ہر چند یہ بات خطرہ سے خالی نہ تھی، لیکن ڈاکٹر پکارڈ (Dr. Piccard) اور ان کے ساتھی پال کپفر (Paul Kappeler) طیارہ ہو گئے اور ۱۹۳۱ء میں اس کا اہتمام شروع کر دیا۔

ڈاکٹر پکارڈ نے جو غبارہ طیارہ کیا وہ دوسرے غباروں سے بالکل مختلف تھا، انھوں نے اپنے غبارہ میں گیند کی شکل کا ایک ظرف الیومینیم کا بنا کر آویزاں کیا تاکہ اس میں ٹھیکر وہ اوپر جاسکیں۔ اس کا قطرات فٹ کا تھا اور اس میں نہایت موٹے شیشے کی کھڑکیاں تھیں تاکہ ان سے باہر کا حال معلوم ہو سکے۔ آکسیجن کی بھی کافی مقدار ساتھ رکھی اور دوسری احتیاطیں بھی کیں تاکہ سردی سے ہلاک نہ ہو جائیں۔ غبارہ کا قطر ایک سو فٹ کا تھا جس میں ۴۰۰۰ مکعب فٹ گیس آسکتی تھی۔

۱۷ مئی ۱۹۳۱ء کو یہ غبارہ روانہ ہوا اور اس کا صرف ساتواں حصہ گیس سے بھرا گیا کیونکہ بلندی پر ہوا کا دباؤ کم ہونے کی وجہ سے گیس کو اور پھیل جانا تھا، اور زیادہ گیس بھرنے سے اس کے پھٹ جانے کا اندیشہ تھا، لیکن قبل اس کے کہ غبارہ بلند ہوتا، گنڈولا (یعنی الیومینیم کا کردی ظرف جس میں پکارڈ بیٹھا تھا) ٹیگی سے سرک گیا اور اس میں تھوڑا سا شگاف ہو گیا۔ جسکی وجہ سے آکسیجن گیس نکلنے لگی، لیکن پکارڈ نے شگاف کو روئی اور ویسلین سے بند کر کے غبارہ چھوڑ دیا۔

یہ غبارہ جرمنی کے ایک مقام آگسبرگ سے روانہ ہوا تھا اور ۲۵ منٹ کے اندر ۲۹ ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ گیا، اور جب وہ ۵۵،۵۰۰ فٹ یا پونے دس میل کی بلندی پر پہنچا تو ایک ہی سطح پر قائم ہو کر میلوں ادھر ادھر تیرنے لگا اور شام ہوتے ہوتے یہ نیچے اتر آیا۔ بعض آلات کے ٹوٹ جانے سے اس تجربہ میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی، لیکن دو باتیں ضرور متحقق ہو گئیں، ایک یہ کہ انسان فضا کے قائمہ تک پہنچ کر زندہ واپس آسکتا ہے اور دوسرے یہ کہ فضا کی شعاعوں کی قوت، فضا کے قائمہ پر بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

۱۷ اگست ۱۹۳۲ء کو ڈاکٹر پکارڈ پھر اڑا اور ساڑھے دس میل اونچا چلا گیا، اس مرتبہ وہ بارہ گھنٹے تک اوپر ہی رہا اور کافی مطالعہ کا موقع اسے مل گیا۔

اس کے بعد روس کے ایک فوجی افسر اور سوویت کے دو سائنس دانوں برنامہ (Barnard) اور گوڈونوٹ (Gudonov) نامی ۲۰ ستمبر ۱۹۳۳ء کو اڑے اور بارہ میل تک پہنچ گئے۔

دو مہینے بعد امریکہ کے بعض بحری افسروں نے کوشش کی لیکن وہ ساڑھے گیارہ میل سے زیادہ اونچے نہ پہنچ سکے سب سے بڑا غبارہ جو اس مقصد کے لئے طیارہ کیا گیا وہ تھا جو جنوری ۱۹۳۴ء میں اڑا اور تقریباً چودہ میل اونچا ہو گیا۔ اس غبارہ کی لمبائی ۱۱۰ فٹ تھی اور وزن دو ٹن تھا۔ قطر ۱۱۵ فٹ تھا اور ۲۵ ہزار مکعب فٹ گیس اس میں بھری جاسکتی تھی اس کے گنڈولا نہایت باریک فولادی چادر کا تھا اور استرے کے پھل سے زیادہ دبیز تھا۔ اس میں ۳۰ فٹ مختلف قسم کے

آلات نصب کئے گئے تھے، جن میں ایک براڈ کاسٹ کرنے والا آلہ بھی تھا، لیکن جب یہ زمین کے قریب آیا تو گنڈولا کی رسیاں ٹوٹ گئیں اور اس صدمہ سے آلات بھی ٹوٹ گئے اور آدمی بھی ہلاک ہوئے۔

اس واقعہ کے چھ مہینے بعد امریکہ کے بعض فوجی انیسروں نے پھر کوشش کی۔ دیگر آلات کے ساتھ براڈ کاسٹ کرنے کا آلہ بھی ان کے پاس موجود تھا۔ جس وقت وہ ۶۰۵ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچے تو انھوں نے زمین والوں کو یہ پیغام بھیجا کہ ”ہمارے غبارہ میں ۵۰ فٹ لمبا شگاف ہو گیا ہے اور ہمارا اوپر جانا بند ہو گیا ہے۔“

اس کے بعد غبارہ نیچے ۳۶ ہزار فٹ تک آگیا، لیکن ہوا کے طوفان نے اسے پھر اوپر کی طرف پھینک دیا۔ اب یہ پیغام موصول ہوا ”غبارہ کا پچھلا حصہ بچھٹ گیا ہے، نہیں کہہ سکتے کہ کتنا کام دیگا۔“

تھوڑی دیر کے بعد یہ پیغام آیا:-

”ہم ۵۰۰ فٹ فی منٹ کی رفتار سے نیچے آ رہے ہیں۔“

اس کے بعد یہ خبر آئی کہ:

”ہم ۲۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے نیچے آ رہے ہیں اور اب ہم کو دنے ہی والے ہیں۔“

چنانچہ جس وقت غبارہ کا فاصلہ زمین سے ۵۰۰ فٹ رہ گیا تو یہ چھتریوں کے ذریعہ سے نیچے اتر آئے۔

دوسرے سال (۱۹۳۷ء) یہ پھر اوپر چڑھے اور اس مرتبہ انھوں نے سارا اگلا پھیلاریکا رڈ توڑ دیا یعنی یہ چودھ میل اونچے چلے گئے۔ ان کا گنڈولا ۹ فٹ قطر کا تھا اور سات ٹن وزنی گویا پکار ڈکے گنڈولا سے نو گنا زیادہ وزنی۔ غبارہ کا رقبہ پونے تین ایکڑ تھا جس میں ۳ لاکھ مکعب فیٹ گیس بھری جاسکتی تھی۔

جو چیزیں یہ اپنے ساتھ لے گئے تھے ان میں تین آلات فضائی شعاع کی قوت ناپنے والے تھے، متعدد تصویر کھینچنے والے کیمرے تھے، روشن و حرارت پیمائیاں آلات تھے لیکن سب سے زیادہ عجیب سامان مکھیوں کے انڈے تھے۔ ان کو اس لئے لے گئے تھے تاکہ ان فضائی گرنوں کے اثرات کا مطالعہ کریں۔

اس جہم کے سر کرنے والے اسٹونس (Stones) اور انڈرسن (Anderson) تھے جو امریکی فوج میں کپتان کے عہدوں پر مامور تھے۔

اس سلسلہ میں غالباً ناموزوں نہ ہوگا اگر ہوائی جہازوں کی بلندی پر دانی پر بھی اک نگاہ ڈال لی جائے۔

۱۹۳۱ء میں ہوائی جہازوں کی انتہائی بلندی پر دانی ۳۱۶۰ فٹ سے آگے نہ بڑھی تھی۔ دو سال بعد ایک اور ہوا باز نے ۶۰۰ فٹ کا اس میں اور اضافہ کیا۔

۱۹۳۳ء میں ایک اطالوی ہوا باز ۵۲۵۳ فٹ تک پہنچا اور اسی سال ایک شخص وائلی پوسٹلے (Wiley Post) ۴۸ ہزار فٹ کی بلندی تک گیا اور سات دن میں اس نے سارے کرہ ارض کا چکر لگا لیا۔

لیکن فرانسیسی ہوا باز کی طرح یہ بھی اس تجربہ میں ہلاک ہو گیا۔

اگست ۱۹۳۶ء میں فرانس کا ایک فوجی طیارہ ۴۸۷۰۰ فٹ اونچا اڑا اور اس کے ۶ ہفتے بعد ایک برطانوی طیارہ ۴۹۹۰۰ فٹ کی بلندی تک پہنچا۔

اس ریکارڈ کو ۱۹۳۷ء میں پھر اٹلی کے ایک ہوا باز نے توڑا، یعنی وہ ۵۱۳۶۱ فٹ چلا گیا، لیکن ۳۱ مئی ۱۹۳۷ء کو ایک انگریزی ہوا باز، اس سے بازی لے گیا اور ۵۳۹۳۳ فٹ کی بلندی تک پہنچ گیا اور سوا دو گھنٹے تک اڑتا رہا۔

ان پروازوں کے سلسلہ میں دو باتیں بہت دقت طلب نظر آئیں ایک یہ کہ اوپر ہوا اس قدر ہلکی ہو جاتی ہے کہ سانس لینا محال ہو جاتا ہے، دوسرے یہ کہ ریڈیو کی لہریں زمین تک نہیں پہنچتیں۔

خیر ہوا کے متعلق تو یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے ساتھ آکسیجن کی کافی مقدار ساتھ لے جائیں لیکن ریڈیو کی لہروں کو زمین تک پہنچانا ہنوز سمجھ میں نہیں آیا۔ بہر حال یورپ کے تمام ممالک میں تجربات ہو رہے ہیں اور غالباً وہ دن دور نہیں جب انسان دس میل کی بلندی پر سات آٹھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑتا نظر آئے گا اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس تکمیل سے دنیا میں اور زیادہ ہلاکت پھیلانے کا کام لیا جائے گا یا امن و سکون کی جدید دنیا کی تعمیر کا!

آپ کے فائدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علیحدہ علیحدہ خرید فرمائیں تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ ہوں:

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی	استفسار و جواب ہر سہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نور روپیہ
معرکہ سخن	مکتوبات نیاز	اردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑ روپیہ	ستائیس روپیہ

لیکن

اگر تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپے میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

عقل کی حماقتیں

موجودہ زمانہ عقل و حکمت کا زمانہ سمجھا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ انسان کی ذہنی ترقیوں کے نتائج کو دیکھ کر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ”خالِ رنجِ زیبا“ کی طرح ان عقلمندیوں میں حماقت کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ امریکہ کی فراست و دانائی کے افسانے مشہور ہیں، لیکن انھیں کے ساتھ ایک یہ واقعہ بھی سن لیجئے کہ ایک چار سال کا لٹا چار آدمیوں کو کاٹ لیتا ہے اور عدالت سے اس کے خلاف قصاص کا حکم صادر ہوتا ہے۔ ہر چند جانوروں کی ہلاکت کے احکام معمولاً عدالت اپیل میں نہیں جاتے لیکن اس کتے کی مالک چونکہ بہت با اثر خاتون ہے اس لئے تیرہ مہینے سے مقدمہ بازی ہو رہی ہے اور اب یہ معاملہ عدالت اپیل کے سامنے آیا ہے جو امریکہ کی سب سے بڑی عدالت ہے۔

انسان اس میں کلام نہیں رسم و رواج کا بندہ ہے اور جو بات ایک بار اس کے ذہن میں سما جاتی ہے وہ مشکل ہی سے نکلتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کتے پر مقدمہ چلانا یا اس کے خلاف حکم قصاص پر عدالت اپیل میں چارہ جوئی کرنا بالکل تضحیح اوقات ہے، لیکن چونکہ عہدِ قدیم اور عہدِ وسطیٰ میں داہمہ پرستی کی بنا پر یقین کر لیا گیا تھا کہ جانوروں میں بھی خمیشت روح سما جاتی ہے اور ان کو بالکل انسان کی طرح ان کے افعال کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا اس لئے اب تک اس کا اثر کچھ نہ کچھ پایا جاتا ہے۔

قدیم زمانہ میں ایک جانور کو انسان ہی کی طرح مجرم قرار دیکر سزا دینے کی مثالیں بہت پائی جاتی ہیں۔ بگلا بہت سیدھا جانور ہے اور لوگ اسے پالتے بھی تھے، لیکن ۱۶۶۶ء میں بہت سے بگلے اس جرم میں سزایاب ہوئے کہ انھوں نے بعض گھروں کو کچھ نقصان پہونچایا تھا۔ نویں صدی میں بعض چھپو ندروں پر سزائے موت کا حکم صادر کیا گیا کیونکہ وہ راتوں کو پریشان کرتی تھیں فرانس، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کی تاریخ میں جانوروں کے خلاف مقدمہ چلانے کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ اسی طرح اٹلی، بلجیم، اسپین، روس، ڈنمارک، انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کی تاریخیں بھی اس قسم کی مثالوں سے خالی نہیں ہیں۔ زیادہ تر جانوروں پر قتل کا الزام قائم کیا جاتا تھا اور اس جرم کے مجرم اکثر و بیشتر سُور ہو کر تھے، کیونکہ اگلے زمانہ میں وہ بہت آزادی کے ساتھ انسانوں سے ملے جلے رہتے تھے اور انھیں اس قسم کے جرم کا زیادہ موقع ملتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں سوائے کاشتکاروں کے دوسرے انسانوں کو بہت کم سُور کے خطروں سے دوچار ہونے کا موقع ملتا ہے، تاہم شہروں میں کبھی کبھی ایسے واقعات سننے میں آجاتے ہیں کہ سُور نے کسی انسانی بچے کو کھالیا۔

اس باب میں وحشی اور پالتو جانوروں کے درمیان بڑا فرق پایا جاتا تھا یعنی پالتو جانوروں کے خلاف شہر کی عدالتوں میں مقدمہ چلایا جاتا تھا اور جنگلی جانوروں کے خلاف کلیسائی عدالتوں میں۔ اس فرق کا سبب یہ تھا کہ پالتو جانوروں کو اپنے مالکوں کے سامنے جوابدہ سمجھا جاتا تھا اور وحشی جانوروں کو خدا کے سامنے جس کی نیابت کلیسا کرتا تھا۔ چنانچہ کلیسائی عدالتیں جن جانوروں کے خلاف فیصلہ صادر کرتی تھیں ان میں سانپ، بچھو، چوہ، ٹیڑیاں وغیرہ بھی شامل ہوتی تھیں۔

جانوروں کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع بھی دیا جاتا تھا یعنی ان کی طرف سے ایک انسانی وکیل بھی مقرر کر دیا جاتا تھا تاکہ ان وحشی جانوروں کے باب میں جو گرفتار نہ ہو سکے ہوں وہ جوابدہی کرے۔ قاعدہ یہ تھا کہ ان کے بھٹ یا غاروں کے سامنے سزا کا حکم پڑھ کر سنا دیا جاتا تھا اور اگر انھیں گرفتار کر کے سزا دینے کی کوئی صورت نہ ہوتی تھی تو پھر بد دعا کی سزا دی جاتی تھی۔

بعض اوقات جانوروں کو شہری عدالتوں میں بھی کھینچ بلایا جاتا تھا۔ چنانچہ جنوبی جرمنی میں یہ قانون تھا کہ جس گھر میں کوئی جرم سرزد ہوتا تھا تو وہاں کے پالتو جانوروں کو بھی اعانت کے جرم میں سزا دی جاتی تھی۔ قدیم روم میں ایک کاشتکار اس جرم میں مانوڈ ہوا کہ اس نے نشان حد بندی پر بھی ہل چلا دیا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے بیلوں کو بھی اعانت کا مجرم قرار دیکر سزا دی گئی۔

برازیل میں اب سے دو صدی پہلے چیونٹیوں کو اس جرم میں سزائے ہلاکت دی گئی کہ وہ ایک خانقاہ کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی تھیں اور لوگوں کے گھروں سے آٹا چراچرا کر لیجاتی تھیں۔ سوئٹزرلینڈ میں ایک بار کسی مرغ پرانڈا دینے کا الزام قائم کیا گیا اور باقاعدہ اس کا مقدمہ عدالت میں پیش ہو۔ عدالت نے بہت چھان بین کے بعد حکم دیا کہ اسے زندہ جلا دیا جائے۔

ایران میں کتوں کے کاٹنے کے متعلق یہ قانون تھا کہ اگر وہ بھونکنے کے بعد کسی کو کاٹے تو خیر، ورنہ اسے سزائے موت ملنا چاہئے کیونکہ خدا نے اسے بھونک کر پہلے سے اپنے ارادہ کی اطلاع دینے کی اہلیت دی ہے۔ جانوروں کو جن طریقوں سے سزائیں

دی جاتی تھیں، ان کی نوعیت جرم کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتی تھی۔ موت کے حکم میں عام پر جانور کو سولی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ بعض صورتوں میں اسے اٹا لٹکا دیا جاتا تھا۔ اور کبھی کبھی گردن کاٹ دی جاتی تھی۔ اگر کبھی صرف سزائے موت ناما کافی سمجھی جاتی تھی تو اس صورت میں اسے زندہ دفن کر دیتے یا جلا دیتے تھے۔ انسانوں کو شکنجہ میں کسکر اعتراف جرم کرانے کا دستور تھا اور اصولاً جانوروں کا اس سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے تھا، لیکن کبھی کبھی جانوروں کو بھی اس عذاب میں مبتلا کیا جاتا تھا، چنانچہ آسٹریا میں ایک بار کسی کتے کو ایک سال تک شکنجہ میں رکھے جانے کی سزا دی گئی۔ روس میں ایک بکری کو جلا وطن کر کے سائبریا کی طرف بھیج دیا گیا۔

فرانس میں ایک گدھے کو صرف اسلئے رہا کر دیا گیا کہ اس کے چال چلن کے متعلق اچھی شہادتیں پائی جاتی تھیں۔ واشنگٹن (امریکہ) میں غیر ملکی سفیر کا کتا بھی ملکی قانون کی گرفت سے بالاتر سمجھا جاتا تھا۔ افریقہ میں، گھڑیاں، بھینسے، شیر اور ہاتھی پر اب بھی سزائے موت کا حکم

صادر کیا جاتا ہے۔ یورپ کی عدالتوں میں بھی بکریوں، کایوں، خچروں، بھیڑوں اور بیلوں کے مقدمات پیش کئے گئے اور انھیں سزائیں دی گئیں۔ لیکن عجیب غریب بات ہے کہ گھوڑے کو اکثر معاف کر دیا گیا کیونکہ اسے بہت قیمتی سمجھا جاتا تھا۔ قدیم یونان میں ایک خاص عدالت مقرر تھی جو نہ صرف جانوروں بلکہ بے جان چیزوں کے خلاف مقدمات کی سماعت کیا کرتی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ طاقت کی مثال مشرق کی قدیم تاریخ میں ملتی ہے کہ ایک درخت کو اس جرم میں کاٹ ڈالا جاتا تھا کہ ایک آدمی کیوں اس سے گر کر ہلاک ہو گیا۔

سہاگ

اس کی شادی ہوئے چند گھنٹے گزرے تھے اور وہ چوتھی کے لئے میکہ آئی ہوئی تھی، کل تک وہ گھر کی سب سے زیادہ باذہب توجہ ہستی تھی مگر آج اس کے دولہا کا راج تھا۔ بڑے مال میں جہاں گانا ہو رہا تھا وہ بالکل بیچ میں بیٹھا ہوا اپنی سالیوں اور سالوں سے ہنسی مذاق کر رہا تھا۔ بوڑھے بچے سب ہی اس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

میں دور کے ایک برادرے میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے اپنی عمر میں کبھی اتنے سگریٹ نہیں پئے تھے ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ انگلیاں پیلی پڑ گئی تھیں کلیجہ جلنے لگا تھا حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ زبان ترخ گئی تھی مگر میں برابر سگریٹ پئے جا رہا تھا۔ میں اُس ساحل کے قریب خاموش بیٹھا تھا جس کو موج خیز لہروں نے ایک ہی ٹکڑے میں پاش پاش کر دیا ہو۔ لہر سے نظر سے اوجھل ہو گئیں تھیں مگر میں ان کو گھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سامنے کا پردہ ہٹا۔ چار لڑکیاں شوخ رنگ کی ساریاں پہنے پہل قدمی کے لئے نکلیں میں لڑکیوں کو سماج کی لعنت سمجھنے لگا تھا اس لئے ان کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ دیکھا — ایک مرتبہ اور دیکھا — پھر دیکھا — کئی بار دیکھا — ان میں ”وہ“ بھی تھی — وہ جس کو اپنے شباب کا پہلی مرتبہ احساس ہوا — وہ جس کے سہاگ کی آج دوسری رات ہے — وہ جس کے حسین قدموں پر کسی نے سر رکھا تھا — وہ جو اپنے ماضی کو اب کسی طرح یاد نہیں کر سکتی — وہ جو اب کسی اور کو اپنے سے محبت کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی — وہ جو اپنے لئے پکاری کی خاطر خدا کو بھلا دے سکتی ہے۔

مجھے یہ یاد نہیں کہ میں اس درخت کے نیچے کس طرح پہنچ گیا۔ جہاں وہ اپنی بہنوں اور سہیلیوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے میں اسے اچھی طرح نہ دیکھا۔ اس کے ساتھی جا چکے تھے۔ میں نے دو دن پہلے اس کی تصویریں واپس کرنے اور خط جلا دینے کی خواہش کی تھی جس کی اس نے شکایت کی۔ میں نے کہا ”تصویریں اب بے جان ہو گئی ہیں ان میں بولنے کی سکت نہیں میں انھیں رکھ کر کیا کروں گا“ اس نے جواب دیا ”مجھے خوش کرنے کے لئے رہنے دیجئے“ جی میں آیا کہہ دوں ”میں اس خدا کو بھی خوش نہیں کر سکتا جو مجھے رنجیدہ دیکھ کر خاموش رہ سکتا ہے“ مگر قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔ میں نے کہا ”محض تمہارے کہنے پر میں نے کل اور آج کی تقریبوں میں شرکت

کی یہ تمھاری ہی مرضی تھی کہ میں نے اپنے گھر کو جلتا ہوا دیکھا اور خاموش رہا۔ تمھاری ہی خواہش تھی کہ کل میں نے تمھارے بھائی کے زہر بھرے کچو کے سہے۔

اس کے بھائی نے اٹھتے بیٹھتے جو طعنے دے تھے ان کی تفصیل میں اس لئے بیان نہیں کر سکا کہ وقت کم اور خطرات زیادہ تھے۔ اس نے پوچھنے کی بہت کوشش کی مگر محض اس ڈر سے کہ میری زہریلی سانسیں خود اس کو جلا کر خاکستر نہ کر دیں، میں نے انکار کر دیا۔

وہ بالکل تنہا تھی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے تھے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے ہمیشہ یاد رکھے گی کبھی نہیں بھولیگی۔ اس نے مجھے اپنی ایک انگوٹھی پہنائی میں نے اس کے گلے میں ایک ہار ڈالا۔۔۔۔۔ یہ آخری دھوکہ تھا جو خود اس نے اور میں نے اپنے کو دیا۔ میں جان چکا تھا کہ وہ مجھے بہت جلد بھلا دے گی مگر میں نے ایک بار خود کو دھوکہ دیا اور اس سے وعدہ لیکر خوش ہو گیا۔ میری نام نہاد مسرت کی یہ مختصر گھڑی ختم اس طرح ہوئی کہ اس کی چھوٹی بہن نے بھاگتے ہوئے آکر کہا اس کا دودھ بھاری طرف آرہا ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ مضبوطی کے ساتھ پکڑ لئے، وہ چھڑانے کے لئے تلملانے لگی میری گرفت اور سخت ہو گئی اس وقت میرے دل میں عجیب احساسات اور جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ میں سماج کے گندہ نقاب کو الٹ دینا چاہتا تھا۔ میں سوسائٹی کی گندگی اُچھال کر مصنوعی پاکیزگی کے وہم کو دور کرنا چاہتا تھا مگر میں جس کشمکش میں تھا اس پر قابو نہ پاسکا میں اس قطعی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا کہ آیا اس نے مجھے دھوکہ دیا ہے یا سماج نے خود اس کو دھوکہ دیا ہے۔

وہ ہاتھ چھڑانے کے لئے انتہائی کوشش کرنے لگی۔ مجھے اس شہاگ پر رحم آگیا جو سماج نے اس کو چند گھنٹے پہلا دیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دئے اور وہ تیزی سے دوسری طرف چلی گئی۔۔۔۔۔ جاتے وقت میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے نازک کاندھوں پر سماج کا وزنی اور گندہ جنازہ لئے ہوئے آسمان کی طرف جا رہی ہے اور قدرت زمین پر کھڑی ہوئی اس کی بے بسی پر کھسیانی منہسی نہیں رہی ہے۔

مرزا ظفر احسن بی۔ اے

سوشل ڈراما
نشا

یعنی ایک دکھیا پاپن کی زندگی کا تماشہ۔ ازکشن پرشاد کول ممبر سرونس آف انڈیا سوسائٹی لکھنؤ۔ قیمت ۷۰/-
مینجر نگار لکھنؤ

پروپیگنڈا

اجتماعی نفسیات کی روشنی میں

”اگر پروپیگنڈا ہوشیاری سے لگاتار کیا جائے تو لوگ جنت کو دوزخ اور دوزخ کو جنت کہنے پر رضی ہو سکتے ہیں“
ہٹلر کا یہ جملہ پروپیگنڈے کے نقصانات کی پوری طرح غمازی کر رہا ہے۔ نشر و تبلیغ ایک اجتماعی قوت ہے اور اس کا کام ترغیبات ذہنی کا سامان فراہم کرنا ہے اس لئے یہ اوزار اُن لوگوں کے ہاتھوں بڑی تباہی پیدا کر سکتا ہے جن کا اُصولِ زندگی صرف ہوس مندی اور جاہ طلبی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ پروپیگنڈا نیک اور اچھے کاموں کے لئے استعمال نہیں ہو سکتا۔ وہ فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ اس کا اچھا یا بُرا استعمال اس کو نیک و بد کی صفات سے متصف کر سکتا ہے۔ جہاں ہم اس سے حرص و آز کی آگ بھڑکانے اور مخالفین کو بدنام کرنے کے کام لے سکتے ہیں وہاں اس کو بین الاقوامیت کی ترویج، امن و سکون کی تبلیغ اور زندگی کی درستی اور اصلاح کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

پروپیگنڈا کوئی نئی چیز نہیں ہے وہ کسی دُکھی شکل میں ابتدائے تاریخ سے انسانی زندگی پر اثر انداز رہا ہے لیکن عصرِ حاضر میں اس سے جس باقاعدہ اور متنوع طریقہ سے کام لیا گیا ہے اس کی زمانہ گزشتہ میں مثال نہیں ملتی۔ سیاسیات، اجتماعی نفسیات اور سائنس کی ایجادات نے اس کے اثرات کو ہمہ گیر بنا دیا ہے اور اس موجودہ وسیع و عریض دنیا کی کوئی تحریک ایسی نہیں ہے جس کو کامیاب بنانے کے لئے اس حربہ کو کام میں نہ لایا جاتا ہو۔

پروپیگنڈا وسیع معنوں میں سائنس کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس فن کی تمام جزئیات کو کسی محدود ضابطہ اور قاعدہ کا پابند بنایا جاسکتا ہے اس کے دائرہ عمل کی وسعت و پہنچائی کا اندازہ کرنا آسان نہیں ہے اس لئے کہ وہ واقعات کے تاثراتِ نفسی سے جمت کرتا ہے اور اس ہر دم رواں دواں زندگی میں واقعات لمحہ بہ لمحہ اور لحظہ بہ لحظہ بدلتے رہتے ہیں۔ پروپیگنڈا کرنے والا چند موٹے موٹے اصولوں کو سامنے رکھتا ہے اور جتنا وہ اُن کو واقعات و حادثات پر منطبق کرتا جاتا ہے اتنا ہی کامیاب ہوتا ہے۔

فنِ نشر و اشاعت کی دو موٹی تقسیمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو وہ سیدھا اور کھلا ہوا طریقہ ہے جس میں ہر مخالفت کو مخالفت ہی کے نام پر شدت کے ساتھ دبایا جاتا ہے۔ دوسرا وہ لطیف طریقہ ہے جس میں تحریکاتِ ذہنی اور اعمالِ توجہ

کے ذریعہ رفتہ رفتہ مخالفانہ خیالات کو زائل کر دیا جاتا ہے اور وہ شخص اس خوشنما فریب عقلی میں مبتلا رہتا ہے کہ یہ تبدیل شدہ رائے اُسی کی دماغی فکر کا استنباطی اور استخراجی نتیجہ ہے۔ ان دونوں طریقوں کے الگ الگ دائرہ عمل ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ موثر ہیں۔ لیکن موخر الذکر طریقہ میں سب سے زیادہ ترقی و عمل کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ اپنے خیالات کو براہ راست طریقہ سے منوانے کے لئے سیاسی گروہ بندی ضروری ہے اور داعی کا اُسی طاقتور جماعت کا ایک موثر رکن ہونا بھی لازمی امر ہے شدید اختلافات کی صورت میں پروپیگنڈے کا ایسا طریقہ زیادہ موثر ہوگا جس میں ترغیب دینے یا مایل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہو۔ اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ آدمی بزعم خود یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی ہی کوشش سے اس نتیجہ پر پہنچا ہے۔

ذیل میں نشر و اشاعت کے چند عام اصولوں سے بحث کی گئی ہے جن میں دراصل داعی کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔ لیکن اس امر سے چشم پوشی نہ کرنا چاہئے کہ وہ بڑی حد تک امواج حوادث کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ اس کا پروپیگنڈا کتنا ہی منظم، مسلسل، اور صناعتانہ تکمیل کا حامل کیوں نہ ہو، محض ایک مخالف موج اس کی ساری تعمیر کو اُلٹ سکتی ہے۔ خارجی تبدیلیوں کے علاوہ داخلی تغیرات بھی انسانی ذہن و دماغ کو متاثر کرتے ہیں۔ پہلک معاملات میں جذبات کی نیرنگی بڑی اہمیت رکھتی ہے ممکن ہے ایک شخص جو کل محبوب خلافت تھا آج مردود قرار دیا جائے اور ایک تحریک جو آج بھید مقبول ہے کل کو اس کے متعلق کوئی گفتگو بھی کرنا پسند نہ کرے، سوسائٹی یا جماعت کی نفسیاتی حالت شبنم کی زندگی سے زیادہ ناپائیدار ہے۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا خیالات کا رخ بدل سکتا ہے۔ اس لئے نشر و تبلیغ کرنے والے کو ذہنی کیفیت کے متعلق کبھی استحکام کا خیال بھی دل میں نہ لانا چاہئے۔ اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی پالیسی اور عوام کی نفسیات میں ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کر دے اور ایسا ”ہم رنگ زمین“ دام بچھائے کہ قوت امتیاز سلب ہو جائے اور اسیری و گرفتاری کے امکانات یقین کے درجہ تک پہنچ جائیں۔ اگر داعی ایسا نغمہ چھڑ سکتا ہے جو بالکل موقع اور موسم کی چیز ہو تو پھر اس کا جذبات پر قابو پالینا مشکل نہیں ہے۔ ذیل کے اصول مذکورہ بالا حدتئاسیوں کے بعد بھید مفید ثابت ہو سکتے ہیں:-

پروپیگنڈے کا سب سے پہلا اصول تکرار و اعادہ ہے۔ پہلک کا حافظہ نہایت کمزور ہوتا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ایک بات کو بار بار اور مختلف طریقوں سے دہرایا جائے۔ ایک چیز جو کل تک بالکل گوشہ گمنامی میں پڑی تھی وہ آج موٹی موٹی سرخیوں کے ذریعہ نہایت آب و تاب کے ساتھ اخبارات میں جلوہ گر ہو سکتی ہے لیکن اگلے روز ممکن ہے کہ وہ پھر طاق نسیاں کی زینت بن جائے۔ موجودہ دنیا کی تیز رفتاری اس درجہ سہو آفریں ہے کہ اکثر واقعات اپنی پوری اہمیت کے انکشاف سے قبل، ذہن انسانی سے محو ہو جاتے ہیں۔ مسٹرائڈن کی وہ تقریر جو انھوں نے اطالوی سٹیو پر ۲ فروری ۱۹۳۷ء کو دارالعوام میں کی تھی آج کتنے لوگوں کو یاد ہے؟ لیکن اُس وقت وہ آفتاب کی روشنی کی طرح تمام کرۂ ارض پر پھیلی۔ ہر شخص نے اس کو پڑھا، سیاسی ایوانوں میں اس پر بحثیں ہوئیں۔ بال کی کھال نکالی گئی، تبصرے اور تنقیدیں ہوئیں۔ لیکن آج اس کی حیثیت تقویم پارینہ سے زیادہ نہیں ہے۔ حال کے اخبارات بھوول بنیادی کے

مقدمہ سے بھرے پڑے ہیں لیکن ایک مہینہ بعد ہمیں یہ بھی یاد نہ رہے گا کہ بیاہتی دیوی کون تھی؟ اور اس کے کیا مطالبات تھے؟ ان وجوہ کی بنا پر داعی کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ نسیان عوام کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے کام کی باتیں بار بار دہراتا رہے۔ تکرار و اعادہ میں تنوع بہت ضروری ہے۔ ورنہ یکرنگی اور یکسانیت بہت جلد پبلک کو اکتا دے گی بعض لوگ تو اس معاملہ میں اتنے جبری ہوتے ہیں کہ تنوع کی خاطر جسمانی تکلیف کی بھی پرواہ نہیں کرتے آڈیو لڈ مائز کے اوپر (جو غالباً آج کل نظر بند ہے) ایک مرتبہ تقریر کے دوران میں پتھروں سے حملہ کیا گیا۔ مخالف اخبارات نے بہتیرا چاہا کہ اس واقعہ کا تفصیل سے تذکرہ نہ ہو اس لئے کہ اس احتمالہ فعل نے فسطائیت کو صفحہ اول کی خبروں میں جگہ دیدی تھی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا تھا۔ ہر اخبار کو اس حادثہ کا تذکرہ کرنا ہی پڑا۔ اس بات سے یہ ضرور واضح ہوتا کہ ترجیحی اور تکراری پروپیگنڈے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ”خبر کا لطف“ ہمیشہ موجود رہے۔

پروپیگنڈے کا دوسرا اہم اصول یہ ہے کہ نظریات و تصورات سے بحث نہ کی جائے۔ عامی کی طبیعت تخصیص پسند ہوتی ہے، وہ واقعات اور شخصیتوں سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے اور عموماً ایک مخصوص اور منفرد واقعہ سے تعمیم کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ اس لئے داعی اور مبلغ کو نظری دلائل پیش نہیں کرنا چاہئے، بلکہ چند خاص واقعات یا حالات کو اس طرح پیش کرنا چاہئے جن سے اس کے مفید مطلب کوئی بات نکلتی ہو۔ لیگ انگریزوں کی معاندانہ روش کو ثابت کرنے کے لئے تہذیبی، تاریخی اور سیاسی دلائل پیش کرے اور وہ علمی اعتبار سے کتنے ہی وقیع کیوں نہ ہوں، مگر ایک عام آدمی اُن سے زیادہ متاثر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اکابر کانگریس کا اردو کے ساتھ دشمنانہ سلوک یا بسوا کے مقدمہ کی مثال غالباً شیدائیان کانگریس کے پندار کو کافی صدمہ پہنچا سکتی ہے۔ اسی طرح کانگریس اگر مالک غیر میں اپنا پروپیگنڈا کرنا چاہتی ہے تو لوگ اس کی تجاویز اور سیاسی فلسفہ سے زیادہ گاندھی جی کی سیرت اور حالات میں دلچسپی لیں گے اور اس طرح بالواسطہ طور پر کانگریس کے اصولوں کی نشر و تبلیغ ہو جائے گی اس لئے کہ دراصل ساری کارگاہ کانگریس گاندھی جی ہی کے بنیادی اصولوں پر قائم ہے۔ اور ہندوستان میں یہ انھیں کی شخصیت ہے جو کانگریس پر شجر سایہ دار کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ اسی طرح چین کے لوگ اگر یہ چاہیں کہ ”میشاق“ اقوام کی تفصیلات سے ہر شخص باخبر ہو جائے تو یہ ممکن نہیں، ہاں اگر وہ مفلوک الحال چارلی سنگ کی داستان جس نے چین کے عروقِ مردہ میں نیا خون زندگی دوڑا دیا دنیا کے سامنے پیش کریں گے تو ہر شخص دلچسپی سے پڑھے گا۔

تقریر کا بھی یہی اصول ہے۔ کامیاب مقرر صرف وہ ہو سکتا ہے جو عوام کے ذوق و رجحان کا لحاظ رکھے اور خاص بات سے عام نتیجہ نکالے۔ مقرر کی سعی یہ نہ ہونا چاہئے کہ اس کی تقریر سے صرف چند اعلیٰ تعلیم یافتہ رمانغ ہی لطف اٹھائیں بلکہ مجمع کی اکثریت مستفید ہو سکے۔ لائڈ جارج، چرچل اور ہٹلر کی تقریروں کی کامیابی کار از صرف اُن کی سادگی، آسان شیلا اور توضیحی انداز بیان میں مضمر ہے۔

بعض اوقات مخالفین کی غلطیوں سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ پچھلی جنگ عظیم میں ”نرس کیول“ کے قتل نے جرمنوں کے خلاف کافی بینراری پھیلا دی تھی۔ حال میں ٹرائسکی کا دردناک قتل بھی استالن کے خلاف منافرت کے جذبات اُبھار سکتا ہو سینٹ جون کو جس طرح نذر آتش کیا گیا اس کا انجام صرف یہ ہوا کہ فرانس میں حب وطن کی عفریت پیکر موبیں اٹھ پڑیں اور انھوں نے ملک کو دشمنوں سے بالکل پاک و صاف کر دیا۔

کارٹون بھی پروپیگنڈے میں بڑی مدد دے سکتے ہیں۔ پچھلی لڑائی میں انھوں نے عوام کے قلب و دماغ کو مسخر کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ جس زمانہ میں جرمنوں نے غیر جانبدار ملکوں کے جہازوں کو تباہ کرنا شروع کیا، اس وقت ایک کارٹون نکلا تھا جس میں یہ دکھلایا گیا تھا کہ چند جرمن آب دوز کشتی میں بیٹھے ہوئے جہازوں کو ہرباد کرنے کی فکر میں مصروف ہیں۔ ناگاہ ایک کشتی نمودار ہوتی ہے جس پر حضرت مسیحؑ سوار ہیں۔ جرمن اسے دیکھ کر بالاعلان کہتے ہیں ”یہ کشتی غیر جانبدار معلوم ہوتی ہے اسے تباہ کر دو“ شکر کے کارٹونوں نے کانگریس پالیسی کی نشر و اشاعت میں کتنا مہتمم بالشان حصہ لیا ہے اس کا صحیح اندازہ آئندہ مورخ ہی کر سکے گا۔ یوم نجات و شکر کے موقع پر اس کا ایک کارٹون نکلا تھا جس میں مسٹر جناح کو ایک جوان بیوہ کی حیثیت سے دکھلایا گیا تھا جو شوہر کی ناگہانی موت کے باعث شدت رنج و غم سے بالکل پتھر کی مورت ہو کر رہ گئی تھی۔ نیچے ٹینیسن کی مشہور نظم کا ایک مصرع لکھا تھا کہ ”اسے رو کر اپنے آپ کو ہلکا کرنے دو، ورنہ یہ درد و کرب کا سیلاب اسکی زندگی ہی کو لے ڈوبے گا“ شاید یہ اسی قسم کی قلم کاریوں کا نتیجہ تھا کہ مسٹر صدیقی بھی جناح صاحب کے اس فعل کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور ہوئے۔

پروپیگنڈے کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ وہ حقیقت اور سچائی سے قطعاً مبرا نہ ہونا چاہئے۔ جرمنوں کو رائی کا پہاڑ کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ سوڈین جرمنوں کے ساتھ چیکو سلوواکیہ کا برتاؤ غیر ہمدردانہ اور ناخوشگوار تھا۔ لادورنسین نے بھی ۱۲ ستمبر کے خط میں جو انھوں نے وزیر اعظم برطانیہ کو لکھا تھا اس کا اعتراف کیا ہے: ”ایک مخالف قوم کا حکومت کرنا بڑی سخت اور تکلیف دہ بات ہے۔ میں ان تاثرات کے ساتھ واپس آیا ہوں کہ سوڈین علاقوں میں چیکو سلوواکیہ کی بیس سالہ حکومت اگر بالکل ظالمانہ اور سفاکانہ نہیں رہی تو اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس نے افلاس فہم و تدبیر اور قدرے غیر واداری کا ثبوت دیا“ اس معمولی اور خفیف بنیاد پر جرمن وزارت اور اخبارات نے بہتان و افترا کا وہ فلک بوس مینار تعمیر کیا جسکے تباہ کن اثرات کا اندازہ کرنے کے لئے اعلانِ پراگ کے صرف یہ الفاظ کافی ہیں: ”چیک امن و سکون کے لئے اس وقت وہی قربانی پیش کر رہے ہیں جو کسی وقت مسیح نے پیش کی تھی“۔

پروپیگنڈے کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اس میں جہاں تک ممکن ہو اختصار برتا جائے، لمبی چوڑی تقریریں یا طویل مضامین، عام پبلک کے نزدیک درخور اعتنا نہیں ہوتے، اُن کے لئے مختصر پیراگراف، چھوٹے چھوٹے مضامین، چست فقرے اور پرزور نعرے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ انقلاب فرانس کا ”حریت، مساوات، اخوت“ کا نعرہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ امریکہ میں سونے اور چاندی کے سکوں کو یکساں رواج دینے پر جو بھگڑا چلا تھا اس کا بھی یہ نعرہ کبھی فراموش

نہیں کیا جاسکتا۔ ”بہنی نوع انسان کو سونے کی صلیب پر مصلوب کرنا ممکن نہیں ہے۔“

بعض اوقات دشمن یا مخالف کوئی ایسا جملہ ادا کر دیتا ہے جس سے داعی بڑا فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اسے نعرہ تحریک بھی بنا سکتا ہے۔ پچھلی جنگ میں جرمنوں نے انگریزی فوج پر طعنہ کیا تھا کہ یہ ”چھوٹی اور حقیر فوج“ کیا لڑے گی۔ اس جملہ نے انگریزوں کو نئے سپاہی بھرتی کرنے میں شاید وقت کی مصلحت اندیشیوں سے زیادہ مدد دی۔ گاندھی جی کا یہ جملہ جو انھوں نے ہندی ساہتہ سمیلن کے اجلاس میں فرمایا تھا کہ ”اُردو قرآن کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے اسے پھیلایا اور بڑھایا، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔“ ہر اُردو سے محبت کرنے والے کے دل میں نشتر کی طرح پیوست ہو گیا اور شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُردو کے تحفظ و بقا کے لئے اس عرصہ میں جو تھوڑی بہت کوششیں ہوئیں وہ سب اسی حملہ کی مرہون ہیں۔

پروپیگنڈے کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ داعی کے سامنے ایک متعین مقصد ہو اور وہ برابر اسی کی جانب بڑھتا رہے۔ بغیر صحیح طرح نظر کے ساری کوشش اسی طرح بیکار اور لالچنی ہے جس طرح بلا شست کے کوئی تیر فضا میں چھوڑ دیا جائے اس میں شک نہیں کہ پروپیگنڈا کرنے والے کو منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے بہت سے دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑتا ہو وہ ایک سائنس داں کی طرح خوش نصیب نہیں ہے جو نتائج و اثرات کا بالکل صحیح اندازہ کر سکتا ہے اور انھیں کی روشنی میں اگلا قدم بڑھاتا ہے داعی اور مبلغ کا معاملہ برعکس ہے۔ اس کی منزل مقصود خواہ دست شوق سے متصل اور تنگاہوں سے بالکل قریب ہی کیوں نہ ہو لیکن نشر و اشاعت کرنے والا شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اتنا قریب آگیا ہے اس لئے کہ اسکے پاس ایسا کوئی آلہ نہیں ہے جس سے وہ پہلک کے تاثرات ذہنی کا بالکل صحیح طور پر اندازہ کر سکے۔ اخبارات ضرور رہنمائی کر سکتے ہیں لیکن ایسا بھی وقت آسکتا ہے جب اخبارات اکثریت کے رجحانات کو نہ پیش کریں یا ان کے اظہار میں کوتاہی کریں۔ اس لئے داعی کے لئے ”بڑھے چلو“ ہی کا اصول مناسب ہے جب تک کہ وہ منزل مقصود پر پہنچ کر اپنی کامیابی پر فخر کرنے کا اہل نہ بن جائے۔ ایسے ملکوں میں جہاں کی اجتماعی زندگی ”یک رنگ و یکساں“ قسم کی ہے وہاں داعی کا کام ذرا ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ ایسے ملکوں میں ذہنی اختلافات کم ہیں اور وہاں یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک خاص محرک کا رد عمل یہ یا اس قسم کا ہوگا۔ لیکن ایسے ممالک میں جہاں معقول اور جائز اختلافات برکت کی چیز سمجھے جاتے ہیں، داعی کو لغزشوں و غلطیوں اور غیر یقینی باتوں کی رعایت کرتے ہوئے، بڑی مستعدی اور پامردی سے اپنے مقصد کی جانب بڑھنا چاہئے۔

پروپیگنڈے کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اصل مقصد پر ایک خوشنما نقاب ڈال دیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ تبلیغ کا موضوع زیادہ محرک خیال اور معنی خیز بن جاتا ہے اور اس میں شک و شبہ کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص نگار یا جامعہ میں انشورنس کے متعلق بڑے شوق سے پڑھے گا لیکن وہی بات اگر ایک انشورنس ایجنٹ بیان کرے گا تو اسے کوئی وقت ہونے لگے گی اور وہ اسے ایجنٹ کے پروپیگنڈے اور ہم خیال بنانے کی کوشش پر محمول کرے گا۔

۱۹۳۷ء میں جرمنی کی اس انجمن نے جس کا مقصد ممالک غیر میں قومی اشتراکیت کی تبلیغ ہے آسٹریا کے اوپر..... ہم چوڑے

خرچ کئے اور ایسا ہم ننگ زمین دام بچھایا کہ اگلے سال یہ سارا روپیہ وصول ہو گیا۔ اسی طرح تحفیت اسلحہ کی کانفرنسوں کی ناکامیابی میں اسلحہ سازوں کی ریشہ دو اینوں کو بہت دخل تھا جنہوں نے اپنے پروپیگنڈے کے ذریعہ ملکی دفاع پر بحیرہ زور دیا۔ جینیوا کی بحری تحفیت اسلحہ کانفرنس کے سلسلہ میں یہ واقعہ بہت دلچسپ ہے کہ اس کے دو سال بعد ایک شخص مسٹر شیرر نے ممالک متحدہ امریکہ کی جہاز بنانے والی تین بڑی بڑی کمپنیوں پر اس وجہ سے دعویٰ کیا کہ انہوں نے مسٹر شیرر کے تمام مطالبوں کو ادا نہیں کیا تھا جو کانفرنس کو ناکام بنانے کے عوض میں ان پر واجب تھا اسی طرح اشتراکیوں نے "امن پسندی" کے پردہ میں بہت کچھ کارروائیاں کی ہیں اور بہت سے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا ہے۔ لڑائی کے زمانہ میں یہ نقاب پوش ہستیاں جن کا کام نشر و تبلیغ ہے ملک کے لئے بڑی خطرناک بن جاتی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جنگ عجیب و غریب چیز بن گئی ہے اس میں محض سپاہی نہیں لڑتے بلکہ ساری قوم۔ اُس کا ایک ایک فرد ہر سر پر کار ہوتا ہے۔ اور محض طیارہ و تفتنگ ہی سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ ریڈیو اور اخبارات بھی اتنا ہی اہم کام کرتے ہیں۔ نیولین کہا کرتا تھا کہ میں چار مخالف اہل دل سے نسبت دس ہزار سپاہیوں کے زیادہ ڈرتا ہوں۔ آج اس جملہ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

پروپیگنڈے میں وقت کا بھی لحاظ ضروری ہے۔ لائڈ جارج کا یہ طریقہ کہ ہر نیچر کی سہ پہر کو اہم موضوع پر تقریر کی جائے جرمنی میں بہت پسند کیا گیا اس میں فائدہ یہ تھا کہ اتوار کے روز سب لوگ اسے فرصت کے ساتھ اخباروں میں پڑھ سکتے تھے اور اخبار بھی سنڈے ایڈیشن میں کافی جگہ ہونے کے باعث اسے پہلے صفحہ پر شائع کرتے تھے۔ پچھلی جنگ میں بھی وقت اور موقع کا بڑا لحاظ رکھا گیا۔ ایک بری خبر اس وقت تک کے لئے روک لی جاتی تھی جب تک کہ فتحیابی کی کوئی خبر اس اثر کو زایل کرنے کے لئے موجود نہ ہو۔

بعض اوقات پروپیگنڈے میں "کم گوئی" بھی مفید اور ضروری ہے جب مخالف غالب ہو اس وقت داعی کی خاموشی فضول گوئی کی نسبت زیادہ مناسب ہے۔ اگر اس کا جواب الجواب زیادہ بد اثر نہیں ہے تو اس کو بری طرح پسپا ہونا پڑے گا۔ ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ وہ کچھ دیر ضبط و تحمل سے کام لے اور پہلے کو موقع دے کہ وہ مخالف کے دلائل کو بھول جائے اس کے بعد داعی کو بہت جلد کسی دوسرے محاذ پر جوابی حملہ کرنا چاہئے۔ اس میں دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ لوگوں کی توجہ پچھلی خفت اور ناکامی کی طرف سے ہٹ جائے گی اور دوسرا یہ کہ مخالف اپنی پچھلی فتح سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا اور وہ جلد ہی "مدا فعا نہ" جگہ قبول کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

یہ ہیں پروپیگنڈے کے عام اصول۔ ان کو دیکھ کر ہم یہ مشکل سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ موجودہ فرن نشر و اشاعت میں جھوٹ کا عنصر کتنا شامل ہے اور اس کی زہر افشائیاں کتنی قیامت خیز ہیں۔ جنگ کے زمانہ میں سب سے پہلی چیز جس پر باب کا گور گرتا ہے "حق و صداقت" ہے۔ جرمنی میں جہاں پر اٹوٹ اصول و عقاید کوئی معنی نہیں رکھتے بلکہ ریاست ہی ایک کل ہے اور جو چیز اس کا جزو محکوم۔ جھوٹ بھی اصول سیاست میں داخل ہو گیا ہے اور اس میں کوئی بڑائی نہیں

سمجھی جاتی۔ منٹلر نے جو وعدہ ہی اس لئے کرتا ہے کہ اس کا ایفاء نہ کیا جائے، کتنی مرتبہ جارحانہ اقدام سے توبہ کی اور قیام امن کا مستحکم وعدہ کیا لیکن اس کا نتیجہ عالمگیر جنگ کی صورت میں نمودار ہوا جس کی شعلہ باریوں نے آدھے سے زیادہ یورپ کو تباہ و برباد کر رکھا ہے۔ حبش کے خلافت (مسولینی کا بیان یہ ہے کہ) اس کو مہذب بنانے اور ظالمانہ اقدامات کی سزا دینے کے لئے فوج کشی کی گئی۔ جاپان نے آج تک چین کے خلافت اعلان جنگ نہیں کیا۔ بلکہ اس کا کہنا یہ ہے کہ وہ پیہم امن و مصالحت کی کوششیں کر رہا ہے۔ اس بے پناہ طغیان کذب و افترا کی روک تھام محض ہمارے ہوش و گوش کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم عقل و دانش کو زنگ نہ لگنے دیں اور ان سے ہمارے کام لیتے رہیں۔

خواجہ احمد فاروقی۔ بی۔ اے

”نگار“ کے خاص نمبر

- (غالب نمبر)۔ غالب شوخ نگار (نثر و نظم) کی حیثیت سے، صفحات ۱۵۶ موہ تصویر غالب (رنگین) جنوری ۳۲ء
 قیمت ایک روپیہ (عہد) علاوہ محصول
 (اردو شاعری نمبر)۔ اردو شاعری کی تاریخ اور ہر زمانہ کے شعراء پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام جو جنوری ۳۵ء
 ہر حیثیت سے مکمل ہے صفحات ۲۳۶۔ مع بعض صاحب قلم کی تصاویر کے ساتھ جس میں ڈیڑھ نگار کی قلمی تصویر بھی شامل ہے۔ قیمت دو روپیہ (عہد) علاوہ محصول
 (ہندی شاعری نمبر)۔ ہندی شاعری کی تاریخ اور مستند شعراء کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب کلام صفحات ۱۶۱ قیمت عہد جنوری ۳۶ء
 ڈرامہ اصحاب کہف۔ خطوط اسکر و الٹڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امانت پر پانچواں جنوری ۳۷ء
 مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے۔ صفحات ۱۴۴۔ قیمت عہد۔ علاوہ محصول
 تاریخ اسلامی ہند۔ یہ تاریخ جس وقت نظر اور کاوش تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے اس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا۔ صفحات ۱۵۲۔ قیمت عہد۔ علاوہ محصول جنوری ۳۸ء
 (مصنفی نمبر) اسکے بعض عنوانات یہ ہیں:۔ حیات مصنفی۔ اردو غزل گوئی میں مصنفی کا مرتبہ۔ مصنفی کی غیر مطبوعہ ثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔ صفحات ۱۶۴۔ قیمت ایک روپیہ۔ علاوہ محصول جنوری ۳۹ء
 (نظیر نمبر) بعض عنوانات:۔ نظیر کا مسلک۔ شاعری پر تبصرہ۔ نظیر اور عوام۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ جنوری ۴۰ء
 صفحات ۱۲۸۔ قیمت عہد۔ علاوہ محصول
 پیشہ نگار لکھنؤ

اعتراف گناہ

سیاہ رنگ کے بورڈ پر سفید حروف سے لکھا ہوا تھا۔
 ”کنفیشن روم“
 اُس کو کسی نے بتا دیا تھا کہ اس کمرے میں مسیح کے پیرو اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ قلب میں صفائی ہو تو گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ارادوں میں استقلال ہو تو نجات مل جاتی ہے۔ مسیح کا مذہب قلب کو صفائی بخشتا ہے اور ارادوں میں استقلال پیدا کر کے نجات عطا کرتا ہے۔

وہ بورڈ کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی، اُس کی آنکھوں نے خزاں کے بیس موسموں کو دیکھا تھا۔ اُن میں تجسس کی ایک عجیب تڑپ موجزن تھی۔ اس تڑپ نے اُس کو کسی چیز کے دلہاۓ احترام سے بے نیاز کر دیا تھا، اُس کے خزاں دیدہ چہرے میں بہار کی سی جاذبیت تھی۔ اُس کی بڑی بڑی جادو کر دینے والی آنکھوں کے نیچے اُس کی تنگ ٹھوڑی نے اُس کے چہرے کو غیر مناسب طور پر یکانت ختم کر کے اُس کو ایک جلدی ہتھیار ڈال دینے والی عورت بنا دیا تھا۔ لیکن اُس کی خاموشی اس کمزوری کو پورا کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔
 وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

سامنے کی دیوار پر عیسے کے صلیب پر چڑھائے جانے کا واقعہ روغن کیا ہوا تھا، شام کی زردی مایل کمزور روشنی میں ہاتھوں سے نکل کر پاؤں تک پہنچنے والا گہرا سرخ رنگ اصلی خون معلوم ہوتا تھا، اس سے نضا کسی قدر ڈراؤنی ہو گئی تھی، دوسری دیواریں بالکل سادہ تھیں۔ سامنے دائیں کونے میں ایک دروازہ تھا، دائیں اور بائیں دیوار سے دفعت اور سامنے کی دیوار سے پانچ فٹ کے فاصلے پر سامنے کی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک جھنگل تھا، جھنگل کے اندر ایک چوکی پر سیاہ لبادہ پہنے ہوئے پادری بیٹھا تھا، اُس کے سامنے چاندی کے فریم میں انجیل رکھی ہوئی تھی، وہ پڑھ رہا تھا۔
 وہ دروازے کے اندر داخل ہو کر کمرے کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

پادری کو معلوم ہو گیا تھا، کوئی اندر آیا ہے، لیکن اُس نے اپنا سر اوپر نہیں اٹھایا، وہ اعتراف کے وقت اسی طرح اپنا سر نیچے رکھنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ جس کو اعتراف کرنے والے کے سنجیدہ جذبات میں دخل انداز نہیں ہونا چاہیے وہ حیران تھا، اعتراف کرنے والا آگے کیوں نہیں آتا۔

وہ حیران تھی، پادری اُس کو آگے کیوں نہیں بلاتا۔

پادری نے ایک لمحے کے لئے اپنا سر اٹھایا، اور نسوانی حُسن کی ایک دلکش تصویر دیکھ کر اُس نے بے پروائی سے اپنا سر جھکا لیا، مذہب انسان کو انسان سے محبت کرنا سکھاتا ہے، مذہب گناہوں کی طرف دعوت دینے والی تمام چیزوں کو نفرت سے دیکھتا ہے، اگر گناہوں کی طرف دعوت دینے والی چیز انسان ہو تو انسان کیا کرے۔ لیکن پادری انسان نہیں اُس نے قابل نفرت چیزوں کو نفرت سے دیکھنا چھوڑ دیا ہے، یعنی ایسی چیزیں اُس کے دل میں نفرت کا خیال پیدا کر دیں، تو وہ اُس کو چھپانا جانتا ہے۔ اگر وہ ایک لمحہ اور اُس عورت کی طرف دیکھتا رہتا تو اُس کی آنکھوں سے حقارت ظاہر ہو جاتی۔ وہ بولا:-

”بیٹی! آگے آ جاؤ!“

وہ پس و پیش کے انداز میں آگے بڑھی اور جنگلے تک پہنچ گئی۔

”مقدس کتاب کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک جاؤ، ہاتھ جوڑو، آنکھیں بند کرلو، سنجیدگی سے اپنے گناہوں کا اعتراف کرو، آسمانی باپ تم کو بخش دے گا۔“

وہ اُسی طرح اپنے دائیں ہاتھ سے جنگلے کو پکڑے کھڑی رہی:

”محترم باپ! اس سے کیا فائدہ ہے؟“

پادری نے مجبور ہو کر ایک بار پھر اُس کی طرف دیکھا:

”لڑکی! تیرے سوال نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ کیا تیرے ماں باپ نے تجھے کچھ نہیں بتایا؟“

”میرے ماں باپ مسلمان ہیں، ایک گھنٹہ پہلے میں بھی مسلمان تھی، میں نے ابھی ابھی مسیحیت قبول کی ہے۔“

خوشی کی ایک لہر اُس کے چہرہ پر دوڑ گئی، وہ پادری کی مصنوعی بلند پوزیشن سے سر کے بل گرا، اُس کے کردار کا ہلکا پہلو سامنے آ گیا، اُس کا وہ ذمہ دارانہ لہجہ مفقود ہو گیا۔

”ادھر۔ تم بڑی عقلمند لڑکی ہو، تم کھوٹا کھرا پہچان سکتی ہو، میں بیوقوف تھا، میں نے تم کو دوسری لڑکیوں کی طرح سمجھا۔ یہ عیسائی لڑکیاں!۔ انھوں نے تو گر جا کر بال روم بنا دیا ہے، وہ نہایت خوبصورت لباس پہن کر آتی ہیں سروں کے دقت اپنے ساتھ واسے بد معاش لڑکے کے ہاتھ میں ناخن چھو دیتی ہیں اور پھر مجھ سے کہتی ہیں۔ بزرگ باپ بچھلے ہفتے

ایک بد معاش لڑکے نے میری عصمت پر حملہ کر دیا، میں آئندہ کے لئے توبہ کرتی ہوں، میں دل سے شرمندہ ہوں اور باہر

جا کر جس لڑکے کے ہاتھ میں ناخن چھبویا تھا، اُس کے ساتھ سینا دیکھنے کو چلی جاتی ہیں، مگر تم ایسی نہیں ہو، عیسائی مذہب کو

دوسرے مذہبوں پر ترجیح دینے والی لڑکی ایسی نہیں ہو سکتی۔ تم نے میری تقریر سنی ہوگی، ضرور سنی ہوگی۔“

”ہاں۔“

پادری سوچنے لگا:-

”کون کہہ سکتا ہے، میری تقریر میں اثر نہیں؟ لوگ مجھ پر ہنستے ہیں، کہتے ہیں میں نے دس سال کی ملازمت میں کوئی عیسائی نہیں بنایا، دراصل میں لاپچی نہیں، ایک عیسائی بنانے والے کو پچاس روپے انعام ملتا ہے، دوسرے پادری جھوٹے سچے طریقوں سے اپنی تنخواہ کو دگنا کر لیتے ہیں، میں حلال کی کمائی کو پسند کرتا ہوں، خیر اچھا ہوا، اس دفعہ مجھے دو سو پچاس روپے ملیں گے، دوسو روپے تنخواہ اور پچاس روپے انعام۔ فرنیچر ہاؤس کابل چکا دوں گا چھ مہینے سے تنگ کر رہا ہے، لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا: ”تم نے میری تقریر کو بہت پسند کیا ہوگا، کتنی فصاحت کے ساتھ میں نے کہا تھا: ”ہم کسی مذہب کے خلاف شکایت نہیں رکھتے، ہم کسی مذہب کے بانی سے عداوت نہیں رکھتے، ہم سب مذہبوں کو سچا سمجھ کر ان کی قدر کرتے ہیں، ہم تمام مذہبوں کے بانیوں کو بنی آدم کا خیر خواہ سمجھ کر ان کا احترام کرتے ہیں لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نجات ڈھونڈنے والوں کو نجات صرف مسیح کے مذہب میں مل سکتی ہے، کیونکہ تمام مذہبوں میں یہی ایک مذہب سچا ہے اور مذہبوں کے بانیوں میں مسیح ہی بنی آدم کا خیر خواہ ہے۔“ مجھے یقین ہے، تم نے میری غیر جانبداری کو بہت پسند کیا ہوگا، اچھا یہ تو بتاؤ کہ میری تقریر میں کونسی ایسی بات تھی جس نے تم کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ سمجھ گئی تھی، پادری ایک کمزور کردار کا آدمی ہے۔

”کیا کہتی ہو؟ کچھ بھی نہیں!“

”تم کو تقریر کرنا نہیں آتی“

پادری کو کیا ایک اپنے مالی پہلو کا احساس ہوا۔ خوشی مایوسی کی شکل اختیار کرنے لگی،

”کیا تم کو میری تقریر نے عیسائی نہیں بنایا؟“

”نہیں۔“

”اور مجھ کو پچاس روپے الاؤنس نہیں مل سکے گا؟“

”نہیں۔“

”پھر میں فرنیچر ہاؤس کابل کیسے ادا کروں گا۔“

”میں نہیں جانتی۔“

”لڑکی! تو بڑی سنگدل ہے؟ میں نے تیری اتنی تعریف کی ہے، کیا تو میرے لئے ذرا سا جھوٹ نہیں بول سکتی، تیرا

کیا بگڑ جائے گا۔ مجھے پچاس روپے مل جائیں گے، مہینہ آرام سے گزر جائے گا، تیرا احسان ہوگا۔“

”میں جانا چاہتی ہوں۔“

”نہیں، نہیں، دیکھو، ٹھہر دو تم نے اپنے گناہ تو ابھی بخشوائے بھی نہیں، تمہاری شکل بتاتی ہے، تم نے بہت گناہ

کے ہیں، کیا تم دوزخ میں جلنا پسند کرو گی، تمہاری بھولی بھالی شکل بتاتی ہے، تم آگ برداشت نہیں کر سکو گی، تم اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہو، نازوں میں پلی معلوم ہو، میں تمہارے لئے ضرور دعا کروں گا، تم کو اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے کی بھی ضرورت نہیں گناہوں کا بوجھ اور اُس پر اعتراف کی بے حیائی، یہ تم نہیں کر سکتیں، اس کے بجائے تم مجھے پچاس روپے آسانی سے دے سکتی ہو، لاؤ میں ابھی خدا سے تمہاری سفارش کرتا ہوں۔“

”میں جانا چاہتی ہوں“

اُس کے لمبے میں سختی پیدا ہو گئی، پادری کی باتوں نے اُس کو بے حد مایوس کر دیا تھا، وہ باہر جانے کے لئے پٹی، پادری نے کہا ”اچھا اگر تم یوں نہیں مانتیں تو مجھے پچاس روپے قرض دیدو، میں پہلی تاریخ کو ادا کر دوں گا۔“

”تم بے وقوف ہو۔“

اُس نے دروازے کی طرف قدم اٹھایا، پھٹی ہوئی آنکھوں سے، کھلے ہوئے منہ کے ساتھ پادری اُس کو دیکھ رہا تھا، اُس کا ہر قدم اُس کے دماغ کے اعصاب پر تھوڑے کا کام دیتا تھا، اُس نے محسوس کیا کہ اُس کا آخری قدم اُس کے دماغ پر آخری ضرب ہو گی، وہ کانپ گیا، وہ آج اس قدر کیوں گر گیا، اُس کی سمجھ سے باہر تھا، جہاں تک اُسے یاد ہے، اُس نے پہلے ایسا کبھی نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ اپنی فطرت کو کامیابی کے ساتھ چھپاتا آیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ عورت قیامت برپا کر دے گی، اس وقت اسکی مسیحیت خطرے میں تھی، وہ تیزی سے اٹھا، جنگلے کی دائیں جانب سے دروازے کے سامنے آیا اور اُس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹی! تم مجھ سے ناراض ہو؟ کیا تمہارا خیال ہے ایک پادری کسی کو ناراض کر کے آرام کی نیند سو سکتا ہے؟ پادری جس نے اپنی تمام زندگی لوگوں کی خوشنودی کے لئے وقف کر دی ہو، میں مانتا ہوں، میں نے حیرت انگیز باتیں کی ہیں، لیکن بیٹی! میرے سینے میں بھی دل ہے، اور دل کبھی کبھی بھٹک ہی جاتا کرتا ہے، آسمانی باپ ہمارے کتنے کتنے بڑے گناہ معاف کر دیتا ہے، کیا تم ان معمولی باتوں کو معاف نہیں کر سکتیں، تم کو دیکھ کر میرے پدرانہ جذبات بیدار ہو گئے تھے، تم کو دیکھ کر مجھے اپنی پیاری بیٹی گھو ریا یاد آگئی تھی، اُس کی ماں کے انتقال کے بعد میں اُس سے ایسی ہی بچوں کی سی باتیں کیا کرتا تھا، جب سے اُس کی شادی ہوئی ہے، میں ایک باپ کے لہجے میں باتیں کرنے کے لئے ترس گیا ہوں، منہوس تھا وہ وقت جب میں نے دوسرے پیشوں کے مقابلہ میں اس پیشے کو اختیار کیا تھا، مجھ کو اپنی حقیقی فطرت سے بلند ہو کر ایک مصنوعی فضا میں رہنا پڑتا ہے، معلوم نہیں جہالت کی کسی بُری ساعت میں میں نے اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہن لی تھیں، لیکن اب اُن کو اتار کر پھینک دینا دشوار ہے۔ میرے جذبات، میرے خیالات، میرے احساسات اور میرے مبوسات پر دوسروں کا قبضہ ہے، میری گفتگو اور میری زندگی پہلک کی نشا کے مطابق ہونی چاہئے۔ میں غلامی کے خلاف ہوں، لیکن خود دوسروں کا غلام ہوں، میں دوسروں کو پیروں کے نیچے کچلا جانے سے بچاتا ہوں، اور خود پیروں کے نیچے کچلا جا رہا ہوں، میں دوسروں کے لئے امن و سلامتی کی دعائیں کرتا ہوں اور خود بچپنی دے بے قراری میں زندگی بسر کر رہا ہوں، بیٹی! تم عقلمند ہو، تم ان باتوں کو خوب سمجھتی ہو گی، آؤ بیٹی! انسان سے نفرت کرنا اچھا

نہیں، میں انسان ہوں، آؤ! مقدس باپ کا دربار سب کے لئے کھلا ہے، وہ تم کو بخش دے گا۔
 ”میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے کے لئے نہیں آئی تھی، بزرگ باپ!“
 ”اور؟“

”میں اس کمرے کو دیکھنا چاہتی تھی، جس طرح کوئی سیر کرنے والا کسی پرانی عمارت کو دیکھنے کے لئے جاتا ہے۔“
 ”عجیب باتیں کرتی ہو، آخر کون ہے، جس نے کوئی نہ کوئی گناہ نہ کیا ہو؟“
 ”میں اپنے گناہوں کو بخشوانا نہیں چاہتی۔“
 ”کیوں؟“

”میں ابھی اور گناہ کرنا چاہتی ہوں۔“

اُس نے ایک لمحہ خاموش حیرت سے اُس کی طرح، دیکھا، اُس نے محسوس کیا کہ وہ اعتراف کے لئے آنے والی معمولی لڑکیوں کی طرح نہیں ہے، اُس کے خیالات بیسویں صدی کے نوجوانوں کی طرح باغیانہ ہیں، لیکن وہ کسی استدلال پر مبنی نہیں، اس لئے زیادہ توجہ کے قابل بھی نہیں، اُس نے اپنے متعلق لڑکی کے دل میں ابھی رائے قائم کرنے کے لئے گفتگو کو طول دے دیا:
 ”عجیب لڑکی ہو، میں نے ساری عمر میں تم جیسی لڑکی نہیں دیکھی، تمہاری بہکی بہکی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو کسی کے خلاف کچھ شکایات ہیں، کیا تم میرے چند سوالات کا جواب دے سکو گی؟“

وہ دروازے کے پاس سے ہٹ کر جنگلے کے نزدیک آکر کھڑا ہو گیا، لڑکی پلٹ کر وہیں دروازے کے پاس کھڑی رہی:
 ”آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

”میں جانتا چاہتا ہوں، تم نے عیسویت میں کیا جاؤ بیت دیکھی؟“
 ”کچھ بھی نہیں۔“

”یہ یوں کہو، تم نے اسلام میں کیا کمزوری محسوس کی؟“
 ”کچھ بھی نہیں۔“

”تو کیا تم مسیحیت کو اسلام سے بہتر سمجھتی ہو؟“

”نہیں، یہ بات نہیں، مذہب اپنی اصلیت میں کوئی بُری چیز نہیں، تمام مذہبوں کے بانی بنی آدم کے لئے فطرتی ہمدردی لے کر آئے تھے، اور ان کے اداروں نے بہت دیر تک دنیا کی امکانی خدمت کی ہے، جب انسانی قانون اپنے ابتدائی مرحلے طے کر رہا تھا، روحانی قانون اپنے غیر مرنی پس منظر کے ساتھ دنیا کی بدعنوانیوں پر قابض تھا، انسانی زندگی کے لئے بلند معیار قائم کرنے میں مذہب پیش پیش رہا ہے، مذہب کی بنیاد کو کوئی شک کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا، ابراہیم، زرتشت، گوتہ، عیسیٰ اور محمد کے احسانات کائنات کے صفحہات پر کبھی نہ ٹٹنے والے حرفوں سے لکھے ہوئے ہیں، لیکن ہم درخت کا مطالعہ اس وقت کرتے ہیں جب وہ

زمین سے باہر آ کر فضا میں بڑھتا ہے، پھوٹتا ہے، پھلتا ہے، درخت لگانے والے کی نیک نیتی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، درخت لگایا گیا تھا کہ لوگ اُس کے سائے میں آرام کریں، بد قسمتی سے درخت خاردار ثابت ہوا جو اپنے نیچے سے گزرنے والے لوگوں کی پکڑیاں اُتار لیتا ہے، ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ درخت کو اچھے پانی سے نہیں سیرپا گیا، اُس کی پرورش عقلمند ہاتھوں نے نہیں کی، آج حضرت عیسیٰ میرے سامنے ہوتے تو میں اُن کو بتاتی کہ اُن کے عالمگیریشن کے قیل ہو جائے گا سب سے بڑا سبب یہ ہو کہ انھوں نے عورت کو ایک گناہوں کی طرف مایل کرنے والی نفرت انگیز چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ دوسرا سبب یہ کہ مسیحیت میں رہبانیت، اور تجرد کو شامل کر کے انسان کے لئے ایک نہ اُٹھ سکے والا بوجھ بنا دیا، نئی عورت نے پُرانی مسیحیت سے اپنے حقوق چھین کر حضرت عیسیٰ کے ادارے کو پاش پاش کر دیا ہے۔ عورت کی یہ شاندار کامیابی انسانی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھی جائے گی ایک دفعہ پہلے بھی حضرت محمد کے وقتوں میں مسیحی استبداد کے اس عمل کی تردید ہو چکی ہے، لیکن وہ ریفارمر ہونے کے علاوہ شاید سیاست داں بھی تھے، اُن کی متعدد شادیاں ہندوستان کے بادشاہ اکبر کی سیاسی شادیوں کے ہوتے ہوئے ممکن ہے، سیاسی مصلحت پر مبنی تسلیم کر لی جائیں، لیکن نفسیاتی نقطہ نظر سے اس پر گفتگو ہو سکتی ہے، اسی کے ساتھ مسلمانوں کو چار شادیوں کی اجازت دینا اور عورتوں کو ہمیشہ کے لئے پردے کی بلا میں مبتلا کر دینا اور قیامت ہو گیا۔

پادری مرعوب ہو گیا، لیکن وہ لڑکی کی غیر معمولی ذہانت کا اقرار کرنا نہیں چاہتا تھا، وہ اپنے کردار کو لڑکی کے کردار سے بلند کر رکھتا چاہتا تھا، اُس کا لہجہ اُس کی غمازی کر رہا تھا۔

”لڑکی! تو نے اسلام کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، وہ واقعی بالکل درست ہے، میں تم کو تمھاری عقلمندی کی داد دینے کے لئے تیار ہوں، لیکن مسیحیت کے متعلق تمھارے خیالات سراسر غلط ہیں، تمھیں مسیحیت کا اور مطالعہ کرنا چاہئے لیکن سوال یہ ہے جب تم دونوں مذہبوں کو پسند نہیں کرتیں، تو تمھارے مذہب بدلنے کا کیا مطلب ہے؟“

”مذہب بدل لینا کوئی بڑی بات نہیں، میں نے مذہب بدل دیا، جس طرح پیرس کی ایک عورت ایک ہفتے کے بعد اپنے کپڑوں کو پُرانا فیشن کے کر بدل ڈالتی ہے، سب مذہب بدلنے والوں کو کسی ایسے ہی مقصد کو سامنے رکھ کر اپنا مذہب بدلنا چاہئے، اخلاقی معیار کی بندی کے حصول کے لئے مذہب بدلنے والا مذہب بدل کر اپنی شخصیت کی کمزوری کا اعلان کرتا ہے، بلند اخلاق کا انسان اپنے اخلاق کی بندی کو قبیح سے قبیح حالات میں بھی برقرار رکھنے کی اہمیت رکھتا ہے، جس میں اہمیت نہیں، اُس کا اخلاق دوسرے مذہب کے دامن میں بھی محفوظ نہیں۔ ایک ماحول سے ڈر کر دوسرے ماحول میں پناہ لینا بزدلی ہے۔ حضرت محمد نے مذہب قبول نہیں کیا تھا مذہب پیدا کیا تھا۔ ہم کو مذہب قبول نہیں کرنا چاہئے، مذہب پیدا کرنا چاہئے ہر شخص کو ایک جدا گانہ مذہب درکار ہے، آزاد دے تعلق، آخر مذہب ہماری زندگی میں کیا حصہ لیتا ہے؟ ہم ماں باپ سے مذہب اس طرح لیتے ہیں جیسے کالج کا ہیڈ کلرک کالج کے لڑکوں سے فیس لیتا ہے، اور اُس کو تمام عمر اس طرح اپنے ساتھ رکھتے ہیں جیسے اپنے سائے کو ہمیشہ اپنے ہمراہ لئے پھرتے ہیں، کالج کا ہیڈ کلرک ہزاروں روپے کے نوٹ وصول کر کے بھی

خود کو روک فیلر کا ہمسر خیال نہیں کرتا اور سایہ تمام عمر ساتھ رہ کر بھی ہم کو کبھی نہیں کہتا کہ میں تمہارا سایہ ہوں۔ اخلاق کے زخم ہم خود اپنے ہاتھوں سے پیدا کرتے ہیں، اخلاق کے پھول بھی ہم خود اپنے ہاتھوں سے لگاتے ہیں، مذہب جبراحتاً نہیں جانتا، مذہب باغبانی بھی نہیں جانتا۔

”کیا اس نااضلانہ تقریر سے تم نے مجھے یہ بتایا ہے کہ تم نے آج عیسائی مذہب کیوں قبول کیا ہے؟“

”نہیں“

اُس کو پادری کی پست ذوقی پرہیزی آگئی۔

پادری بولا: ”میں تو سیدھے سادھے الفاظ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے عیسائی بننے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟“

”سچ سچ؟“

”ہاں“

”بالکل سیدھے سادھے الفاظ میں؟“

”ہاں“

”سنو! میں نے مسیحی مذہب اس لئے قبول کیا ہے تاکہ میں گرجا کو مال روم سمجھ سکوں، حسین سے حسین کپڑوں میں یہاں آیا کروں، سروس کے وقت اپنے ساتھ والے برمعاش لڑکے کے ہاتھ میں ناخن چھو دوں، باہر جا کر اُس کے ساتھ سیر کیلئے جاؤں، اُس کے ساتھ سینما دیکھوں، زندگی کی تمام لذتیں حاصل کروں، دُنیا کے تمام گناہ کر ڈالوں، اور تمہارے سامنے آکر کبھی اپنے گناہوں کا اعتراف نہ کروں۔“

”کیا کہتی ہو؟“

”سچ کہتی ہوں“

”تم جاسکتی ہو“

لڑکی تن کر کھڑی ہو گئی، اُس کا جوش غصے میں تبدیل ہونے لگا، اُس نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا:-

”تم میری توہین کر کے مجھے باہر نہیں نکال سکتے، میں ایک معزز لڑکی ہوں۔“

”کیا معزز لڑکی کو ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟“

”شرم سب سے بڑی بے شرمی ہے۔ بے شرمی سب سے بڑی شرم ہے، عورت کے دل میں شرم پیدا کر کے آدمی

نے عورت کو بغاوت کے ناقابل بنادیا، اس وقت عورت کو دو دشمنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، شرم اور آدمی، عورت بغاوت

پر آمادہ نظر آتی ہے، تو آدمی اُس کے جذبات سے ایسٹل کرتا ہے۔ عورت بیدار ہوتی ہے، تو آدمی لوریوں سے پھر اُس کی

آنکھیں بند کر دیتا ہے، بے شرمی بیداری ہے، شرم آنکھیں بند کرنا ہے۔“

پادری نے یہ محسوس کر کے کہ کہیں لڑکی کی تیز گفتگو کو سنکر لوگ ڈاکٹھا ہو جائیں، اُس نے معذرت کے لہجے میں کہا:۔
 ”خفا کیوں ہوتی ہو؟“

”خفا اس لئے ہوتی ہوں کہ جس مقصد کے لئے اتنی دور سے آئی تھی وہ پورا نہیں ہوا۔“
 ”کیا مقصد؟“

”آج سر دس کے وقت کوئی ناخن چھونے کے لئے نہیں ملا، رات کس طرح گزرے گی۔“
 ”بے شرم لڑکی!“

”میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں، بڑے حوصلہ افزا الفاظ ہیں۔“

”یہ سب تمہارے ماں باپ کا تصور ہے، تمہاری تربیت اچھی نہیں ہوئی۔“

”میرے ماں باپ کو مجھے تربیت دینے کا کیا حق تھا؟ میری تعلیم اور میری تربیت میرا معاملہ ہے، ماں باپ رہنمائی نہیں کرتے، ماحول رہنمائی کرتا ہے، ماں باپ اب جہل پیدا کرتے ہیں، ماحول محمد پیدا کرتا ہے۔ وقت حرکت میں ہے، ایک منٹ میں ایک لاکھ میل چلتا ہے، سو سائٹی ساکن ہے، اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتی، ماں باپ ایک لاکھ میل فی منٹ کے حساب سے دوڑنے والی ٹرین پر سفر کرنے سے ڈرتے ہیں، اور چپ چاپ بے حرکت ایک دقیانوسی چھکڑے میں جس کے پہلے ناہموار پتھر ملی زمین نے چکنا چور کر دئے ہیں، بیٹھے رہتے ہیں، ناگہاں کوئی اُن کی حالت پر رحم کھانے والا پیدا ہو جاتا ہے، اور اُن کو اور اُن کے دقیانوسی چھکڑے کو ایک لاکھ میل فی منٹ دوڑنے والی ٹرین کے نیچے پھینک دیتا ہے۔“

”گستاخ لڑکی! تو ماں باپ کے احسان سے بھی انکار کرتی ہے۔“

”مجھ پر میرے ماں باپ کے احسانات اس قدر ہیں کہ میرے لئے اُن کا شمار ناممکن ہے، بہرہ کف میں کوشش کر دوں گی۔“
 میرے ماں باپ کسی قدر بد قسمت واقع ہوئے ہیں، سیب کے درخت کا بیج بوتے تھے، مولیاں اُگ آتی تھیں، ایک نہیں، دو تھیں، اکتھنی چھ لڑکیاں اُن کے ہاں پیدا ہوئیں اور صرف ایک لڑکا، میرے والد پی، ڈبلیو، ڈی میں جمہدار تھے، تنخواہ قلیل تھی رشوت ناممکن تھی، میری بڑی دو بہنوں نے چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی کیونکہ چوتھی جماعت تک تعلیم مفت ہوتی ہے، میں آٹھویں جماعت تک پہنچ گئی، کیونکہ میں نے چوتھی جماعت میں وظیفہ حاصل کر لیا تھا، میرا بھائی ساتویں جماعت میں سات دفعہ فیل ہوا، اس لئے اسکول سے اُٹھایا گیا، بھائی کے مقابلے میں ہمارے ساتھ بہت بُرا سلوک ہوتا تھا۔ اُس وقت ہمیں کبھی بغاوت کا خیال نہیں آیا، کیونکہ ہمیں بھی اپنے لڑکی ہونے کو نفرت سے دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ دو بڑی بہنوں کو اور مجھ کو چھوڑ کر، میرے ماں باپ کو پہلے ہمارے بھائی کی شادی کرنے کا خیال آیا، سودا اس طرح قرار پایا کہ لڑکی ہمارے بھائی سے منسوب ہوگی، اُس کے دو بھائیوں کو میری دونوں بہنیں بیاہی جائیں گی اس طرح خرچ کم ہوا، اور صرف سات سو روپیہ قرض لینا پڑا، جو بعد کو سود سے بارہ سو روپے ہو گیا اور ہمیں مکان بیچ کر حساب میباق کرنا پڑا، میری ایک بہن کا خاوند درزی تھا، غالباً اُس کا کام کم چلتا تھا، اپنے ماں باپ

سے اور میری بہن سے لڑتا رہتا تھا، ایک دن موقع پا کر روپوش ہو گیا۔ اب تک اُس کا پتہ نہیں کہاں ہے، میری بہن واپس آگئی، دوسری بہن کا خاندان دیریلوے اسٹیشن پر کال مین تھا، ایک دفعہ ایک گارڈ کو جگانے گیا جگانے سے پہلے اُس کے لٹکتے ہوئے کوٹ میں سے تین روپے ساڑھے سات آنے نکال لئے، خانساں نے پکڑ لیا، یہ اُس کا چھٹا جرم تھا، اس لئے اُس کو لمبی قید ہو گئی۔ میری بہن ہمارے ہاں واپس آگئی، شادی کے چھ ماہ بعد بھائی یکایک پاگل ہو کر غائب ہو گیا، ابا نے اُن کی بیوی کو واپس نہیں بھیجا کہ جانے لڑکا کب واپس آجائے، اب ہم ایک ہی نجیرے میں ایک ہی جنس کے سات جانور تھے۔ اس لئے گزارا مشکل ہو گیا، تھوڑے عرصے کے بعد دوسری لڑکیوں کی شادیوں کا سوال پیدا ہوا، دوکان میں مال زیادہ تھا، گاہک کم تھے، اس لئے والدین نے کوڑیوں کے دام مال نکال ڈالنے کا تہیہ کر لیا۔ میری منگنی پولیس کے کانسٹیبل سے ہوئی، میں اُس وقت دسویں جماعت کی پرائیویٹ تیاری کر رہی تھی، ایک ایف اے کلاس کا عیسائی لڑکا پڑھائی میں میری مدد کیا کرتا تھا، میں اُس کے ساتھ بھاگ گئی، ایک ہفتہ گزر گیا، اُس کو ملازمت نہ ملی، آٹھویں دن اُس نے اپنے بوٹ بیچ کر ہوٹل کے اخراجات ادا کئے، ہم دونوں کے پاؤں برابر تھے۔ وہ میری سلیم بہن کو ملازمت ڈھونڈنے کے لئے چلا گیا، پھر واپس نہیں آیا، ہوٹل میں ایک منظمین کھانا کھانے کے لئے آیا کرتے تھے۔ میں نے اُن کو اپنی طرف مائل کر لیا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئے، چار دن ٹرک آرام سے گزرے، پانچویں دن رات کو دو بجے کے قریب اُن کی بیوی اور تین بچے اُن کے سارے کے ساتھ بغیر اطلاع آگئے۔ اُن کی بیوی نے اُن کو بہت برا بھلا کہا۔ اُن کے سارے نے مجھے بہت مارا۔ وہ مجھ کو اپنے ایک دوست کے ہاں چھوڑ آئے، وہ انکم ٹیکس آفس میں کلرک تھے، مجھ کو اُن سے بہت نفرت ہے، پارسا بنے پھرتے تھے، مجھے ہمیشہ بہن کہتے تھے بقتے دن دیاں رہی نن بن کر رہی۔ اُن کے ہاں سنیما کے ایک نیچر آیا کرتے تھے، میری اُن سے آنکھ لڑ گئی۔ ایک دن موقع پا کر اُن کے مکان پر پہونچ گئی۔ جتنی دیر اُن کے پاس رہی سینما اور سیر میں زندگی بسر ہوئی، ایک دن آکر کہنے لگے، میری منگنی ہو گئی ہے، مجھے بہت فسوس ہوا، کہنے لگے: گھبراؤ نہیں، میں تم سے محبت کرتا ہوں، قیامت تک تمہارا رہوں گا، ایک غرض سے شادی کر رہا ہوں، لڑکی کے ماں باپ بہت امیر ہیں، میں نے اُن کو شادی کے بعد فلم کمپنی جاری کرنے پر آمادہ کر لیا ہے، تم میری چیف ایکٹرس ہو گئی، تمہارے ساتھ رہنے پر اعتراض کرتے ہیں، میں تم سے جدا ہونے پر مجبور ہوں، اس ٹرین سے چلی جاؤ، وہاں ایک کمپنی کے منیجر میرے دوست ہیں، وہ تمہیں اپنی کمپنی میں لے لیں گے، میں نے اُن کو خط لے کر میں یہاں آگئی، یہاں اتفاقاً ایک عیسائی لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ سیاہ رنگ کے خوبصورت کپڑوں میں ملبوس تھی۔ میں نے پوچھا: کہاں جا رہی ہو؟ اُس نے کہا: گڈ فرائڈے ہے، اگر جا جا رہی ہوں۔ میں نے کہا: کیا تم ہمیشہ گر جا جاتی ہو؟ اُس نے کہا: نہیں، میں اتنی پُرانے فیشن کی نہیں، ایک دوست سے وعدہ ہے۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ ایکٹرس کی زندگی سے عیسائی لڑکی کی زندگی بہتر ہے، ایکٹرس اپنے دل کی زندگی بسر کرتی ہے، لیکن بدنام ہے، کرسمین لڑکی اپنے دل کی زندگی بسر کرتی ہے اور معزز ہے، ایکٹرس آزاد ہے، لیکن اُس کی آزادی مظلوم عورت کو آدمی کے پنجے سے نہیں چھڑا سکتی۔ کرسمین لڑکی آزاد ہے اور اُس کی آزادی آدمی سے عورت کی صدیوں کی بے انصافیوں کا انتقام لے سکتی ہے، میں نے اُس سے کہا: میں عیسائی ہونا چاہتی ہوں، وہ خوش ہو گئی۔ شاید اُس کو بھی تمہاری طرح

الادنس کا خیال تھا، میں یہاں آگئی، اور اب تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔“

”لڑکی! میری آنکھوں سے اوجھل ہو جا!“

”میں جا رہی ہوں، لیکن مجھے افسوس ہے، میں اب تک ایک اندھے کو چراغ دکھاتی رہی ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”تم اندھے ہو، اور میں چراغ ہوں۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا میں خوبصورت نہیں ہوں؟“

”ایک پادری کو عورت کا حسن گھائل نہیں کر سکتا۔“

”یہ میرے حسن کی توہین ہے، حسن کا جادو گھائل کرنے ہی کے لئے ہوتا ہے، تم فطرت کے قانون کو نہیں توڑ سکتے۔“

”لیکن بیوقوف لڑکی! میری عمر ۴۵ سال کی ہے۔“

”میں ۲۰ سال کی ہوں، صرف ۲۵ سال کا فرق ہے، کوئی بڑی بات نہیں، اس کے معنی صرف یہ ہوئے کہ تم مجھ سے

۲۵ سال پہلے مر جاؤ گے، اور میں ۲۵ سال زندہ رہوں گی، میں خوش ہوں۔“

”لڑکی! اس معاملہ میں بہت سمجھنے سوچنے کی ضرورت ہے۔“

”محبت میں سمجھنا سوچنا حرام ہے!“

”محبت!“

”میں تم سے محبت کرنا چاہتی ہوں۔“

پادری کے انکار کی دیوار پہلے ہی کمزور تھی، اس فقرے نے اُس کو بالکل گرا دیا، وہ ایک دفعہ پھر اپنی پرزیش کو بھول گیا، اُسکو اپنی خشک زندگی میں رنگینیوں کی ایک جھلک آتی ہوئی معلوم ہوئی، اُس نے اپنے شکست خوردہ کھسیانے پن کو چھپانے کی بید کوشش کرتے ہوئے کہا:۔

”گلوریا کی ماں کے انتقال کے بعد بہت لوگوں نے مجھے اس قسم کی ترغیبات دی تھیں، لیکن۔۔۔“

”لیکن دیکھ کچھ نہیں، میں کوئی عذر سننے کے لئے تیار نہیں۔“

”لیکن اس عمر میں شادی کرتے ہوئے کچھ ڈر معلوم ہوتا ہے۔“

”شادی! شادی کرنے کے لئے تم سے کس نے کہا، میں کہتی ہوں، میں تم سے محبت کرنا چاہتی ہوں، کہاں محبت اور

کہاں شادی، دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، گویا تم مجھے قید کرنا چاہتے ہو، نہیں نہیں، یہ نہیں ہوگا۔ ممکن ہے کل کو مجھے

تم سے کوئی بہتر آدمی مل جائے، شادی ہوگئی تو تم مجھے اُس کے ساتھ کب جانے دو گے؟“

دروازہ کھلا، ایک لڑکا سیاہ سوٹ میں داخل ہوا، لڑکی کے جواب نے پادری کے جذبات کو مجروح کر دیا تھا، اُس کی گویائی کی طاقت فنا ہو چکی تھی۔ دروازے کا کھلنا اُس کے زخم پر مرہم ثابت ہوا، اُس نے اطمینان کا ایک سانس لیا، لڑکے نے اندر آتے ہی کہا ”پاپا! آپ کیا کر رہے ہیں، ایک گھنٹہ ہو گیا، لوگ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں، انہوں نے مجھے بھیجا ہے، کہتے تھے، جاؤ، دیکھو، ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ تمہارا باپ کیا کر رہا ہے۔“

”ولیم! یہ ایک پاگل لڑکی ہے۔“ پادری نے اپنے حواس سنبھالتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے مرا کر لڑکے کی طرف دیکھا اور اُس پر بھیڑنے کی طرح جھپٹی، اُس کو کوٹ کے کالروں سے پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا اور دائیں دیوار کے ساتھ پوری طاقت سے پٹخ دیا، پھر اُس کی طرف بھاگی اور اُس کو کونے میں جا کر دیوچ لیا، گھٹنوں کے نیچے پھینک کر دونوں ہاتھوں سے اُس کے گلے کو دبانا شروع کر دیا، پادری اُن کی طرف بھاگا، لڑکے نے اپنے دائیں ہاتھ کی پشت سے اُس کے دائیں رخسار پر ایک خوفناک طمانچہ مارا، پادری نے پیچھے کی طرف اُلٹے ہوئے ”بچاؤ، بچاؤ!“ کا شور مچا دیا۔ لوگ اندر آ گئے، انہوں نے اُن کو علیحدہ علیحدہ کر دیا، لڑکی تیز تیز سانس لیتے ہوئے کہنے لگی:

”مار ڈالوں گی، اس مردود نے مجھے بہت پریشان کیا ہے، مجھے گھر سے بھاگ کر لے آیا، ہوٹل میں مجھے چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ میرے سلیپر بھی پہن گیا، اور آج جبکہ میں اور اس کا باپ آپس میں محبت کر رہے تھے، رقابت سے جل کر ہماری محبت میں رخنہ ڈالنے کے لئے اندر آ گیا، میں نے اس کے باپ کی شادی کی درخواست کو رد کر دیا ہے، لیکن محبت کی راہ میں یہ حائل نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ہمارے معاملے میں دخل دے گا، تو میں اس کو چھوڑ دوں گی نہیں، مار ڈالوں گی۔“

وہ پھر اُس کی طرف جھپٹی، لیکن لوگوں نے اُس کو روک لیا، ولیم بھاگ کر ایک کونے میں چھپ گیا، اس کے بعد لوگوں نے حیران ہو کر پادری کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اُس نے کہا:

”غالبا میرے عقلمند دوستوں کو مجھ سے اتفاق ہو گا کہ لڑکی پاگل ہے۔“

ولیم کو کچھ حوصلہ ہوا، اُس نے پیچھے سے آگے آ کر ایک آدمی کی آڑ لیتے ہوئے اُس کے کندھے کے اوپر سے کہا:

”پاگل لڑکی! کیا میں اتنا پاگل تھا، کہ ایک پاگل لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے تیار ہو جاتا، ہوٹل کے سات دن کے قیام میں تم نے مجھے گیارہ دفعہ مارا، آٹھویں دن مجھے تم سے ایک بہتر لڑکی مل گئی، وہ تم سے زیادہ خوبصورت تو نہیں لیکن تم سے زیادہ دو لقمہ ہے، مجھے ملازمت ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہاں سے بھاگ کر ہم یہاں آ گئے، اب وہ ایک فیکٹری میں سینوٹو پائسٹ ہے، وہ کماتی ہے، میں کھاتا ہوں۔“

”ساری عمر میں تو نے آج ایک عقلمندی کی بات کی ہے، کیا میں اُس لڑکی کو دیکھ سکتی ہوں جو تمہارے دل سے مجھ کو نکال کر خود تمہارے دل کی مالک بن گئی، میں اُس لڑکی کی تعریف کرتی ہوں۔“

ولیم نے خوش ہو کر ”جین! جین!“ پکارنا شروع کیا، جین لوگوں کو چیرتی ہوئی آگے آ گئی، وہ سیاہ کپڑوں میں ملبوس

ایک نوجوان لڑکی تھی، لڑکی نے جین کو دیکھ کر مسرت کے لہجے میں کہا:
 ”بزرگ باپ! یہی وہ لڑکی ہے، جو آج مجھے ملی تھی اور جس نے کہا تھا: میں اتنے پُرانے فیشن کی نہیں کہ چرچ میں
 عبادت کے لئے جاؤں، میں وہاں اپنے دوست سے ملنے جاتی ہوں، میں اس لڑکی کو پسند کرتی ہوں، اس نے مجھے عیسائی کیا
 ہے، اس کو الائنس ملنا چاہئے۔“

”پاگل لڑکی!“ پادری نے حقارت سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور سامنے کے دائیں دروازے سے باہر نکل گیا
 ”پاگل“ ”پاگل“ ”پاگل“ ”پاگل“

لوگ لڑکی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے، کمرہ خالی ہو گیا، ہر طرف سکوت چھا گیا وہ کمرے
 کے درمیان اکیلی کھڑی رہی۔ ایک لمحہ سکتے کا عالم رہا، پھر وہ آہستہ آہستہ جھکے کی طرف بڑھی، بائیں جانب سے ہو کر سامنے
 کی دیوار پر عیسے کی تصویر کے آگے کھڑی ہو گئی، آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ اٹھایا اور عیسے کے پاؤں پر سر رکھ دیا اور بولی:-
 ”تمہاری ماں کنواری تھی، میں بھی کنواری ہوں، تمہاری ماں نے تم کو پیدا کیا، کیا میں بھی کسی کو پیدا کر دوں گی؟“
 وہ زندہ کے درد سے ہڈی ہال ہو کر نیچے گر پڑی۔

انور

”نگار“ کے پچھلے پرچے

”نگار“ کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت
 ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:

۲۶ء: جنوری ۸ء - ۲۷ء: اگست ۸ء - ۲۸ء: مئی ۸ء - جون ۸ء - ۲۹ء: مئی ۱۲ء -
 ۳۰ء: جولائی تا دسمبر ۸ء فی پرچہ - ۳۱ء: جنوری ۱۲ء - فروری، مارچ، مئی، جون، جولائی، ستمبر، نومبر ۸ء فی پرچہ -
 دسمبر ۸ء - ۳۲ء: فروری ۸ء - ۳۳ء: فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۸ء فی پرچہ -
 ۳۴ء: دسمبر ۱۲ء فی پرچہ - ۳۵ء: فروری، مارچ ۱۲ء فی پرچہ - اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ء فی پرچہ -
 ستمبر، اکتوبر، دسمبر ۱۲ء فی پرچہ - ۳۶ء: فروری، اپریل تا دسمبر ۱۲ء فی پرچہ - ۳۷ء: فروری تا جولائی ۱۴ء فی پرچہ -
 اگست و ستمبر ۱۲ء فی پرچہ، اکتوبر و نومبر ۸ء فی پرچہ -

منیجر نگار لکھنؤ

گاندھی جی اور فلسفہ عدم تشدد

اگرچہ سیاسیات عالم میں جہاں تا گاندھی کا فلسفہ عدم تشدد ایک استعمال شدہ کار توس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ تاہم وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ضرور ہیں اور عوام کے نزدیک اُن کی اس عالمگیر مقبولیت کا راز اُن کے فلسفہ عدم تشدد میں نہیں ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ممالک غیر میں اُن کا یہ اقتدار صرف اس لئے ہے کہ پیشوایان جمہوریت ہر اُس چیز کو غیر معمولی اہمیت دے دیتے ہیں۔ جو اُن کے خیال کے مطابق جمہوریت کی بنیادی خامیوں اور تمدنی بے اعتدالیوں کی پردہ داری کر سکے اور ہندوستان میں اُن کی پرستش کا باعث عوام کی ذہنی بے ماگی ہے کہ آج نہ جانے کتنے لوگ مذہب و روحانیت کی آڑ سے لوگوں کو فریب میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ دُنیا کو آج تک جتنا فریب دیا گیا ہے اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری مذہبی اداروں پر عاید ہوتی ہے یا روحانیت کے علمبرداروں پر۔

میں گاندھی جی کی نیت پر تو شک نہیں کرتا کہ انھوں نے بھی شہرت حاصل کرنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ مگر ہاں یہ یقینی ہے کہ وہ بھی ”ایشوری کرپا“ کے فریب خوردہ ہیں، یونہی وہ یہی فرماتے ہیں کہ ”دیش کے آگے اہنسا کا سیدھا راستہ دکھانا مجھے ایشوری کرپا سے حاصل ہوا ہے“ لیکن اس اہنسا کا صحیح مفہوم متعین کرنے سے ان کا دماغ ابھی تک قاصر ہے۔

جب کبھی مجھے گاندھی بھگتوں سے فلسفہ عدم تشدد پر تبادلہ خیال کا موقع ملا میں نے دیکھا کہ وہ واقعات سے ہٹ کر روحانیت کی طرف آنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسی ایسی باتوں کا ذکر شروع کر دیتے ہیں جن کا تعلق عقل سے بہت کم ہے۔ ایک بھی کانگریسی انسانہ طور پر حالات پر تبصرہ کرتے وقت عقلی دلائل سے اجتناب نہ کرتا۔

اگر کلیتہً عدم تشدد پر عمل کیا جائے تو انسان محض مٹی کا بت بن کر رہ جائے اور انسانی ارتقا جو کئی صدیوں سے جاری ہے اور ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یکدم (نہایت دنا بود) ہو جائے۔ فلسفہ عدم تشدد کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان کی قوت مدافعت فنا ہو جاتی ہے اور وہ ہمیشہ پردہ غیب سے کسی معجزہ کے ظہور پر پیر ہونے کا منتظر رہتا ہے۔ انھیں مروجہ سیاسی و معاشی نظام کو دیکھتے ہوئے حصول مقصد کے لئے عدم تشدد انہیں غیر مؤثر اور فرسودہ ہے۔

جس وقت گاندھی جی کا سیاسی شعور بیدار ہوا۔ تو آپ کے اعصاب روبرو انحطاط تھے۔ آپ کی لیڈر می اسی وقت قائم رہ سکتی تھی جب عدم تشدد کی قسم کا کوئی طریقہ ایجاد کرتے۔ سیاسی حیثیت سے گاندھی جی کی ڈانوا ڈول طبیعت راجی و رعایا دونوں

کے لئے بعید از فہم ہے۔ راجکوٹ کی بھوک ہڑتال اور اس کے بعد اظہار افسوس اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

اس مقالہ سے ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے وہ یہ کہ شاید مقالہ نگار کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی تشدد کے ذریعہ سے حاصل کی جائے، لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا، میں نے تو عدم تشدد کے صرف نفسیاتی محرکات کا مختصر سا جائزہ لیا ہے اور اس کے سیاسی پہلو سے مجھے کوئی بحث نہیں۔

م

(نگار) یہ مقالہ ایک ہندو کا ہے اور اس کی اشاعت کا مقصد صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ گاندھی جی کے متعلق خود ان کی قوم کے بعض افراد کیا خیال رکھتے ہیں۔ مجھے مقالہ نگار سے کئی باتوں میں اختلاف ہے۔ ایک یہ کہ وہ مذہب کے ساتھ روحانیت کے بھی مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک مذہب و روحانیت دونوں ایک چیز ہیں۔ یعنی مذہب کی حقیقی نیت یہی ہونا چاہئے کہ انسان میں روحانیت پیدا ہو، لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ مذہب نام ہے صرف چند مخصوص معتقدات کا، خواہ انسان میں روحانیت پیدا ہو یا نہ ہو، تو روحانیت کا ذکر یقیناً مذہب سے علیحدہ ہونا چاہئے یعنی مذہب کوئی حقیقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو لیکن ”روحانیت“ کی ضرورت کو یقیناً تسلیم کرنا پڑے گا۔

اس جگہ مجھے مختصراً ”روحانیت“ کے مفہوم کو واضح کر دینا چاہئے۔ ”روحانیت“ سے میری مراد تصوف یا فلسفہ تصوف نہیں جس کے ادارے اس وقت بہ کثرت سر جگہ پائے جاتے ہیں اور جن کی عثمان سیادت جوگیوں، سادھوؤں اور پیروں کے ہاتھ میں ہے بلکہ ”روحانیت“ میری رائے میں ”بلندی اخلاق“ کا دوسرا نام ہے اور اخلاق کی بلندی کا مقصد صرف یہ ہونا چاہئے کہ تمام ”افراد نوع انسانی“ کو خواہ وہ کسی ملک و ملت اور کسی رنگ و نسل سے متعلق ہو ایک ہی شیرازہ انسانیت سے وابستہ سمجھا جائے، روحانیت کی دنیا میں نہ کوئی ”کافر“ ہے اور نہ کوئی ”ملکش“ بلکہ ہر شخص انسان ہے خواہ وہ خدا کا ماننے والا ہو یا اس کا منکر

پروردہ چراغِ حرم و دیر نہ داند

اس معیار کو سامنے رکھ کر جس وقت ہم گاندھی جی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ روحانیت سے خالی نہیں ہیں، لیکن اسکی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک ان کی زندگی ”مذہبیات“ سے بلند نہ ہو جائے۔ وہ اپنے آپ کو بت پرست ہندو کہتے ہیں اور یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک بت پرست انسان روحانیت کی ہرکات سے ایک حد تک متمتع ہو سکے، لیکن روحانیت کے ارتقائی مدارج اس وقت حاصل نہیں ہو سکتے، جب تک ہم ہندو مسلم، خدا و بت، صمد و صنم کے امتیاز سے بے نیاز ہو کر اپنا مذہب صرف ”انسانیت پرستی“ قرار دیں۔ گاندھی جی زبان سے تو یہی کہتے ہیں، لیکن شاید ان کا حال ان کے قال کا ہم آہنگ نہیں اور اس لحاظ سے میرے نزدیک وہ قدر اذل کے انسان نہیں کہے جاسکتے۔

دوسری بات مجھے اس سلسلہ میں فلسفہ عدم تشدد کے متعلق کہنا ہے۔ یہ فلسفہ گاندھی جی کی ایجاد نہیں ہے بلکہ اس سے قبل بھی

لوگوں کے دماغ میں آپکا ہے اور اجتماعی حیثیت سے نہیں تو انفرادی حیثیت سے ہار ہا اس پر عمل ہوا ہے اور ہوتا رہے گا۔ ”ہتیا دینا“ ہندوستان کا مشہور محاورہ ہے، جس کا تعلق یہاں کی قدیم مذہبی معاشرت سے بہت دیرینہ ہے۔ ایک کمزور کا اپنی جان دیکر قوی و ظالم کو عذابِ آخری کے خوف میں مبتلا کرنا یہ ہے اصل مذہبی تخیل اس فلسفہ کا، یا علمی زبان میں یوں سمجھئے کہ اپنے آپ کو ہلاک کر کے فریقِ ثانی کو ملامتِ ضمیر کے عذاب میں مبتلا کرنا اس کا حقیقی مقصود ہے۔ ہر چند اس میں کامیابی اسی وقت ہو سکتی ہے، جب دوسرا بھی اسی مذہبی تخیل کا قایل ہو یا وہ ایسا متاثر ہونے والا ضمیر رکھتا ہو، کیونکہ آج تک اس کا ثبوت نہیں ملا کہ نیرو، کالیگولا، اور نادر شاہ نے کبھی اس بات پر تاسف کیا ہو کہ انھوں نے کیوں اتنے بے گناہ انسانوں کا خون بہایا، تاہم اگر اس فلسفہ پر سختی کے ساتھ عرصہ تک عمل کیا جائے تو ایک وقت کامیابی کا آسکتا ہے، لیکن شاید اتنی تباہیوں کے بعد کہ ان کی تلافی اس دنیا میں ممکن نہ ہو۔ ایک جلاد کی تلوار سے گردنیں کٹواتے رہنا، یہاں تک کہ خود اس کا ہاتھ شل ہو جائے کوئی معمولی تجربہ نہیں ہے۔ چنانچہ جس وقت گاندھی جی نے نازی حکومت کے خلاف ”حکومت برطانیہ“ کو اس فلسفہ پر عمل کرنے کا مشورہ دیا تو بلا استثنا بھی نے اس کا مذاق اڑایا۔ لیکن اس سلسلہ میں ہم کو فلسفہ ”تشدد“ پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ اپنے حقوق طلب کرنا اور ان کو کسی نہ کسی طرح حاصل کرنا ہر قوم کا فرض ہے، یہاں تک کہ اگر وہ یوں آسانی سے حاصل نہ ہو سکیں تو جنگ و جدال سے بھی احتراز نہ کرنا چاہئے، لیکن ہر تدبیر کا ایک وقت ہوا کرتا ہے۔ آپ نے تو اس مسئلہ کے سیاسی پہلو پر بحث کرنے سے قصداً گریز کیا ہے اور شاید اس ڈر سے کہ مہاد“ قانون تحفظ ہند“ کی زد میں آجائیں، لیکن میں اس پر بحث کروں گا، کیونکہ صاف دلی کے ساتھ کھل کر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر آپ کے نزدیک ”عدم تشدد“ بیکار چیز ہے تو اس کا لازمی منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ ”تشدد“ کے قایل ہیں، یعنی اگر ہندوستان کی آزادی کا سوال سامنے ہے تو ہمیں لڑ بھڑ کر اسے حاصل کرنا چاہئے۔ اصولاً بالکل صحیح ہے، لیکن عملی حیثیت سے اس پر نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ نتیجہ کے لحاظ سے تشدد و عدم تشدد دونوں ایک ہی چیز ثابت ہوں گے، یعنی جانیں دو ٹوٹ کر آپ کو خطرہ میں ڈالنا پڑیں گی اور نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔ تشدد نام ہے حرب و قتال کا، جنگ و جدال کا اور یہ ذریعہ صرف اسی وقت اختیار کیا جاسکتا ہے جب ہم دشمن کے طریق جنگ کا جواب دینے کے لئے ہر بات میں اس کے برابر ہوں، ورنہ تشدد کو ہم خود کشی کہیں گے یا دوسرے الفاظ میں ”ہتیا دینا“ جو عدم تشدد ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس وقت ”تشدد“ کے حامیوں کی نیت کا سوال نہیں ہے بلکہ حالات کے لحاظ سے ”تشدد“ کے محل یا بے محل ہونے پر حکم لگانے کا سوال ہے۔ یہ تو زبان سے تشدد کہہ دینا آسان ہے، لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا، اس سے ہمارے ملک کے بہت سے نوجوان بے خبر ہیں۔

ابھی ہم قتلگاہ کا دیکھنا آسان سمجھتے ہیں

نہیں دیکھا شنادر جوئے خون میں اسکے توسن کو

نیری رائے میں ہندوستان کی آزادی کا وقت ابھی نہیں آیا اور نہ شاید کبھی آئے کیونکہ جب تک یہ ملک مسجد و مندر، اذان و ناقوس کی نعت سے آزاد نہ ہو جائے، اس کو آزادی کے نام لینے کا حق حاصل ہی نہیں۔ اور اگر برطانوی حکومت نے اکثریت کی قوت سے متاثر ہو کر ہندوستان کو آزاد کر دینے کا فیصلہ کر لیا (جس کی کوئی امید نہیں) تو یہ ایک خاص قوم کی آزادی ہوگی، ملک کی آزادی نہ ہوگی۔ ہندو مسلمان دونوں ایک دوسرے سے جس قدر بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں اس کا اقتناء آزادی نہیں بلکہ غلامی ہے اور اس صورت میں تشدد یا عدم تشدد کی مدد سے آزادی کا مطالبہ کرنا دونوں ایک حکم رکھتا ہے۔ جب تک آزادی نہ ملے اس کے لئے خون بہانا تو خیر کوئی معنی بھی رکھتا ہے، لیکن آزادی ملنے کے بعد جب کشت و خون کا بازار گرم ہوگا تو اسے آپ کیا کہیں گے؟

مکتوبات نیاز

حضرت محترم - کتاب پہونچی - سرسری نگاہ سے دیکھنا اس کی توہین ہے، اور تفصیلی مطالعہ و استفادہ کی فرصت شاید ابھی چند دن اور میرے آئے۔ لیکن آپ کو جاننے والا سمجھ سکتا ہے کہ یہ تصنیف کتنی پاکیزہ ہوگی۔

آپ نے جس موضوع کو لیا ہے وہ نیا نہیں، لیکن جو پہلو بحث کا آپ نے اختیار کیا ہے وہ بالکل نئی چیز ہے۔ اسی کو ماہرانہ بصیرت اور عالمانہ درک کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں صرف اسی مذہب کا قائل ہوں جو تمام غیر فطری اور غیر ضروری این و آں سے بلند ہو کر محض "انسانیت" کی پرستش کا درس دینا کو دے اور اگر یہ مقصد "لامذہبیت" سے حاصل ہو سکتا ہے تو میرے نزدیک یہی بہترین مذہب ہے۔

تصور ہمیشہ میری پریشاں خیالی کی جا رہا ہے، لیکن اُس کا علمی یا فلسفیانہ پہلو نہیں جس میں "لطیف قلب" یا "حقیقت و سرف" وغیرہ کی اصطلاحوں سے بحث کی جاتی ہے، بلکہ اس کا اخلاقی پہلو، اس کا دالہانہ مشرب، اس کا نعرہ "ہمہ دوست"، اس کا آواز "پندرام توئی" کہ اگر آپ علی زندگی میں اس کی تفسیر کریں تو نتیجہ وہی "انسانیت پرستی" نکلتا ہے۔

محبت کا بندہ ہوں، محبت ہی کی آواز مجھے ابھی معلوم ہوتی ہے اور میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آ سکتی کہ خدا آپ کا ہو سکتا ہے، میرا نہیں۔ حرم بھی اسی کا، دیر بھی اسی کا، اذان میں بھی اسی کی پکار ہے، ناقوس میں بھی اسی کی چپکار ہے، "ضلالت و گمراہی" کتنی و سخبات ہماری وضع کی ہوئی اصطلاحیں ہیں، وہ ان سب سے بلند ہے، مذاہب نے حقیقی خدا کی حقیقت کو کبھی نہیں سمجھا، بلکہ خود ہی ایک خدا وضع کیا اور اس کے حدود دنیا کے سامنے پیش کئے۔ یہ سب خدا کا "السانی تصور" ہے، خدا نہیں۔ میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے اصطلاحی مذہب سے کیوں نفرت پیدا ہوئی۔

ایک دن مجھے نہایت ضعیف عورت نظر آئی جو دھوپ میں بیٹھی ہوئی پتھر توڑ رہی تھی، میں نے اُسے بلا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ بہت کسنی میں اس کے والدین کا انتقال ہو گیا۔ شادی کے بعد اس کے شوہر نے چھوڑ دیا، اس کے دو بیٹے تھے، جن کو مزدوری کر کے اُس نے پالا، بڑا کیا، لیکن وہ بھی جوان ہو کر طاعون میں مر گئے اب پورے بیس سال سے اس کی زندگی یہ ہے کہ پتھر توڑ کر آنے دو آنے پیدا کرتی ہے اور جہاں جگہ ملی رات کو پڑ رہتی ہے۔

اس کے ہاتھ اس قدر کمزور تھے کہ ہتھوڑا بھی نہ سنبھال سکتی تھی اور بینائی اتنی ضعیف ہو گئی تھی کہ کبھی کبھی بجائے پتھر کے

وہ اپنے ہاتھ کو نمی کر لیتی تھی، بدن پر اس کے کپڑے تو خیر کیا، کپڑے کے کچھ تار تھے، جن کے اندر سے اس کے جسم کی جھریاں نظر آتی تھیں میں نے اس کی قومیت پوچھی تو معلوم ہوا کہ ”تیلن“ ہے۔

یہ سنتے ہی میرے سامنے مسلمانوں کا یہ عقیدہ سامنے آیا کہ ”جو مسلمان نہیں اُسے اُخروی نجات نہیں مل سکتی“۔ اور اسی کے ساتھ یہ خیال کہ کیا خدا واقعی اس عورت کو جہنم میں ڈال دے گا! میں ایسے خدا کے خیال سے کانپ اُٹھا، اسلام کے اس ظالمانہ فیصلہ کی طرف سے میرے دل میں کراہت سی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ اسلام کی حقیقت کچھ اور ہونی چاہئے، ایک فطری مذہب، خدا کا ایسا بُرا تصور کبھی پیش نہیں کر سکتا کہ ایک بڑھیا، جس کی ساری عمر انتہائی تکلیف میں گزری ہو، جس کے ماحول نے اسے ایک جانور کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور رکھا ہو، جس کی بیدست و پائی نے کبھی اس بات کا موقع نہ دیا ہو کہ وہ دنیا میں کسی کو تناسک، بلکہ ہمیشہ وہی ستانی گئی ہو، وہ محض اس تصور پر جہنم میں ڈال دیا جائے کہ اس نے اصول اسلام کے مطابق خدا کو نہیں مانا تھا۔ اس کی ساری زندگی اس بات سے بالکل خالی الذہن ہو کر بسر ہوئی کہ خدا کیا اور مذہب کیسا۔ اس کو اپنی مصیبتوں سے کبھی نجات ہی نہیں ملی کہ ”معیبتوں سے نجات دلانے والے خدا“ کا شکریہ ادا کر سکتی۔ لیکن اسلام کا فتویٰ یہ ہے کہ اسے ضرور جہنم میں ڈالا جائے گا کیونکہ وہ ایک بُت پرست ہندو خاندان میں پیدا ہوئی اور اسلام کی روشنی سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔

اس کے بعد میں سوچنے لگا کہ کیا ہندو خاندان میں پیدا کرنے والا اور اس کے ماحول کو اسلام کی روشنی سے دور رکھنے والا کوئی اور خدا تھا؟ کیا ایسی قوت جو ساری عمر ایک ایک دانہ کو محتاج رکھے اور مرنے کے بعد بھی آگ میں جھونک دے، واقعی خدا کہلانے کے قابل ہے؟ کیا خدا انسانوں کا سا احساس رکھتا ہے، کیا واقعی اسے تکلیف ہوتی ہے اگر کوئی اسے دمانے، کیا وہ سچے مچے خوش ہوتا ہے اگر کوئی اس کی پوجا کرے، کیا واقعی اس میں جذبہ غیظ و انتقام پایا جاتا ہے، کیا اتنی بڑی کائنات کا پیدا کرنے والا اس قدر پست و دنی بات کر سکتا ہے کہ وہ اس بڑھیا کو جہنم میں ڈال دے صرف اس خطا پر کہ اسے مسلمان ہونے کا کوئی موقع نہ ملا تھا۔ کیا وہ سوائے مسلمانوں کے اور تمام دنیا کے انسانوں سے جو یقیناً مسلمانوں سے تعداد میں بہت زیادہ ہیں، ناراض ہو گیا وہ ان سب کو دوزخ کی آگ میں ڈال دے گا، کیا یہ کوئی بڑی عمدہ بات ہے کہ وہ اپنے تمام بندوں کو صرف مسلمانوں کی خوشنودی کے لئے ہمیشہ عذاب میں مبتلا رکھے۔ اُسے کس نے مجبور کیا تھا کہ وہ جہنم کا ایندھن بننے والی مخلوق اتنی تعداد میں پیدا کرے، اس سے کس نے کہا تھا کہ وہ انسان پیدا کرے بھی تو اس قدر ”مجبور ماحول“ کہ خود اس کے اختیار میں کچھ نہ ہو۔ کیا اس کے اختیار میں تھا کہ وہ سب کو مسلمان پیدا کرتا، کیا یہ اس کی قوت سے باہر تھا کہ دنیا میں ہر شخص کو اسلام کے برکات سے فائدہ اُٹھانے کا موقع دیتا؟ پھر اگر ایسا نہیں ہے تو اس میں انسان کی کیا غلطی ہے اور وہ کیوں اس جہنم کی پاداش میں پکڑا جائے جس کے کرنے پر وہ مجبور تھا۔ الغرض یہ اور اسی قسم کے خیالات تھے، جنہوں نے مجھے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ خدا کا وہ تصور جو عام طور پر مسلمانوں کے دلوں میں قائم ہے صحیح نہیں ہو سکتا اور اسی وقت سے میری روح میں اضطراب برپا ہے جو کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتا۔ میں قومیت کے لحاظ سے بیشک مسلمان ہوں اور اسلام کے بتائے ہوئے اصول کو بھی اچھا سمجھتا ہوں، لیکن اسلام کے اس عقیدہ کو کبھی

نہیں مان سکتا کہ سوائے مسلمانوں کے سب گمراہ ہیں اور آخر وہی نجات سے محروم !
تصوف سے مجھے بیشک سکون ہوتا ہے اور صرف اسلئے کہ وہ خدا کے ٹکڑے نہیں کرتا۔ اسکے ہاں، ہندو، مسلمان، گبر و ترسا،
یہود و نصاریٰ، سب کا خدا ایک ہی ہے، اور بہت مہربان خدا ہے۔
اورنگ زیب سیاسی حیثیت سے کتنا ہی قابل ستائش بادشاہ رہا ہو، لیکن اخلاقی دنیا کا بادشاہ، دارا شکوہ بھٹا اور
میں بھی اس کی طرح اس مشرب کا قایل ہوں کہ

گُفرو اسلام در رہش پویاں
وعدہ لا الہ الا گو یاں

اگر آپ نے اپنی کتاب میں بھی اسی پہلو کو سامنے رکھ کر بحث کی ہے تو میرے نزدیک صحیفہ آسمانی ہو، لیکن اگر آپ صرف اصطلاحات
تصوف میں الجھ گئے ہیں تو میں اسے دیکھ کر کیا کروں گا۔

حضرت، "گورکھ" کی حمد و چکی، خدا کے لئے اب "مردوں" سے منہ موڑ کر "زندوں" کی طرف توجہ فرمائیے ! یہ کیا قیامت
ہے کہ جب تک کسی کا کفن گل کر خاک نہ ہو جائے اور ہڈیاں راکھ نہ بن جائیں آپ کے نزدیک قابل اعتناء ہی نہیں۔
اسلام زندگی لیکر آیا اور زندگی ہی کا درس اس نے دیا، لیکن آپ فرماتے ہیں، اسلام نام ہے تابوت و کفن کی یاد کا۔
اگر آپ کسی کو نسا نہیں سکتے، تو کم از کم زلائیے تو نہیں، اکابر کے کارناموں کو یاد کر کے خوش ہونا چاہئے، نہ یہ کہ ان پر آنسو بہایا جائے
گویا وہ کوئی بڑا رختہ دین میں ڈال گئے ہیں !
میں آپ کی تصنیف کی کیا داد دوں، اور اس پر کیا لکھوں۔ کتاب کے اچھے ہونے میں شک نہیں۔ آپ کی زبان، آپ کی
تلاش، اور آپ کی نیت سب اپنی اپنی جگہ ستائش کے قابل ہیں، لیکن افادی حیثیت سے البتہ میں اس کو بیکار سمجھتا ہوں۔ اگر
اسی قسم کی رائے آپ چاہتے ہیں تو یہ حاضر ہے۔

محترم۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ مجھے اپنا وعدہ یاد تھا، لیکن دکن سے واپسی ایسی عجلت میں ہوئی کہ نہ میں بروقت اطلاع
دے سکا اور نہ سفر قطع کر کے آپ کے پاس قیام کر سکا۔ مجھے آپ سے زیادہ افسوس ہے، لیکن جانتا ہوں کہ زندگی نام ہے انھیں
افسوسناک حوادث کا۔ ہم آپ کہاں تک سر دھنیں گے۔ جو ہو جائے اسی کو ٹھیک سمجھئے اور جو نہ ہو اس کا غم نہ کیجئے۔
اب آخری وقت میں جینے کا یہ ڈھب معلوم ہوا ہے، آپ ہی اس سے فائدہ اٹھائیے۔ جس مسئلہ میں آپ نے میری تفصیلی رائے
طلب کی ہے، اس کو فی الحال ملتوی کر دیجئے تو بہتر ہے، وقت آیا تو میں خود بغیر آپ کی یاد دہانی کے لکھ بیچوں گا۔

جناب من - خط ملا، لیکن یہ دیک کر باتیں کرنا مجھے پسند نہیں، اگر آپ مجھ سے کھل کر بات نہیں کر سکتے، تو اس ظاہر داری کی کیا ضرورت ہے۔ اگر اس ترکیب سے یہ مقصود ہے کہ میرے دل کا حال آپ کو معلوم ہو جائے اور آپ کے خیال سے میں بخیر ہوں تو میں اس کے لئے آمادہ ہوں، لیکن صاف صاف کہہ دیجئے کہ ہاں مدعا یہی ہے۔

بہر حال میں اس باب میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور نہ کہنے کی ضرورت۔ میرے نزدیک آپ اور وہ دونوں ایک ہیں۔ اگر آپ بُرے ہیں تو وہ بھی اچھے نہیں، اور اگر آپ اچھے ہیں وہ بھی ایسے بُرے نہیں۔ آپ کے دماغ کی راہیں جتنی پیچیدہ ہیں، اتنی ہی میری بھی ہوتیں تو شاید میں سمجھ سکتا کہ آپ کس زاویہ سے ہر معاملہ کو دیکھتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ سعادت مجھے نصیب نہیں۔ آپ کیوں مجھے اس مسئلہ میں گرفتار کرنا چاہتے ہیں جو تنہا آپ ہی کی ”اختراعِ فایقہ“ ہے۔ اس فخر میں کسی اور کا شریک ہونا آپ کی ذہانت کی توہین ہے۔

ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟

جنوری ۱۹۶۷ء کا ”نگار“

اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک ہمیشہ تذکرہ ہوگا

شاعری پر انتقادی مقالات بکثرت شائع ہوتے رہتے ہیں، لیکن تبصرہ نگار ہمیشہ اپنے نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہیں اور اس وقت تک جتنے تذکرے لکھے گئے ہیں ان سب میں تذکرہ نگاروں نے اپنے ذوق کے مطابق انتخاب کلام کیا ہے، لیکن خود شاعروں کے نقطہ نظر کو معلوم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔

جنوری ۱۹۶۷ء کا ”نگار“ موجودہ عہد کے تمام بڑے بڑے شعراء اور اچھے غزل گو حضرات کے کلام کے لئے وقف ہوگا اور جو انتخاب دیا جائے گا وہ خود شاعروں کا کیا ہوا ہوگا۔ ہر شاعر کے حالات بھی ہوں گے اور کلام پر اڈیرنگار کی رائے بھی درج ہوگی۔ اس وقت تک حسب ذیل شعراء کے کلام کا انتخاب آچکا ہے:

آرزو لکھنوی۔۔۔ آسی الدینی۔۔۔ جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔۔۔ احسان دانش۔۔۔ علی اختر اختر۔۔۔ بنجود دہلوی۔۔۔
مرزا آقب لکھنوی۔۔۔ جلیل ناپوری۔۔۔ جوش ملیح آبادی۔۔۔ حفیظ جالندھری۔۔۔ دل شاہجہاں پوری۔۔۔ سیاب اکبر آبادی۔۔۔
فانی بدایونی۔۔۔ فراق گورکھپوری۔۔۔ پنڈت دتاتریہ کیفی۔۔۔ انند نرائن لا۔۔۔ تلوک چند محروم۔۔۔ حکیم ناطق لکھنوی۔۔۔
نوح ناروی۔۔۔ وحشت کلکتوی۔۔۔

حسرت موہانی۔۔۔ جگر مراد آبادی۔۔۔ مرزا یگانہ چنگیزی۔۔۔ محشر لکھنوی۔۔۔ تاجور نجیب آبادی۔۔۔ ناطق گلاوٹھوی اور
بعض دوسرے شعراء کا انتخاب بھی موصول ہونے والا ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

خلع بل اور مولانا کفایت اللہ

(ایک خاتون)

انح مکرم حضرت نیاز صاحب مدنیو ضہم،
تسلیمات عرض - تصدیقہ درگزر - جرات نظر انداز، ۱۴ اکتوبر کے ہفتہ وار رسالہ تہذیب نسواں میں مولوی کفایت اللہ صاحب
دہلوی کا مضمون خلع بل کے متعلق میری نظر سے گزرا۔ جس کو پڑھ کر میرے ہر بن مو سے شعلے نکلنے لگے۔ ہائے یہ مولوی کس قدر سنگدل
ہوتے ہیں، تبھکو جناب کے سوا کوئی نظر نہیں آتا جو بے رورعایت اس مضمون کا دندان شکن جواب دے سکے۔
ایسا جواب دیکھ کر جو شعلے ہمارے جنت کے ٹھیکیداروں کو اپنے گود لپکتے نظر آنے لگیں۔ یہ معلوم مولویوں کا عذاب کب تک
ہندوستان کے مسلمانوں پر مسلط رہے گا۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم معلقہ عورتیں کسی طرح بھی اپنی زندگی نہ سنوار سکیں۔
خلاصہ یہ ہے:

مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ کاظمی بل میں ایک دفعہ یہ ہونا چاہئے کہ انفساخ نکاح کا فیصلہ مسلمان ہی کی عدالت سے ہو تو جائز
ہے ورنہ جو عقد دوسرے مذہب والوں کی عدالت سے منع ہو گا وہ ناجائز ہے اور نکاح برقرار رہے گا اور جن عورتوں نے اب تک
خلع حاصل کر کے دوسرا عقد کیا ہے وہ گمراہی میں ہیں اور گناہ کربہی ہیں۔ گویا عدالت سے انفساخ نکاح کے فیصلہ کے
بعد بھی عورت چھٹکارا نہ پاسکے۔

برادر مکرم - یہ مولوی ایک بار اور آپ کو کافر بنائیں گے تو بنانے دیجئے۔ مگر اس کا جواب دیکر آپ اجر و دایر کے مستحق
ہوں گے اور حج اکبر کا ثواب ملے گا۔

(منگوار) خیر، حج اکبر کا ثواب تو میں اس قدر آسانی سے حاصل کرنا پسند نہیں کرتا، لیکن چونکہ خلع و طلاق کا مسئلہ ہماری معاشرت کا

نہایت اہم مسئلہ ہے اور اس کو کسی ایک فریق کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا یقیناً مناسب نہیں، اس لئے میں اپنی رائے اس باب میں ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مولانا کفایت اللہ صاحب کی تحریر جس کا ذکر آپ نے کیا ہے، میری نگاہ سے نہیں گزری، لیکن اگر ان کی تحریر کا منشاء وہی ہے جو آپ نے بیان کیا، تو یقیناً مجھے اس سے اختلاف ہے۔

ہندوستان میں نہ اسلامی حکومت قائم ہے اور نہ اسلامی شریعت۔ اس لئے مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ان کے تمام مسائل کا فیصلہ از روئے شریعت اسلامی کیا جائے، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مسائل میں ”قانون محمدی“ کی رو سے فیصلہ کیا جاتا ہے، لیکن قانوناً یہ امر ضروری نہیں کہ فیصلہ کرنے والا مسلمان ہی ہو۔ وراثت کے جھگڑے عام طور پر سول عدالتوں میں ہندو اور انگریز ججوں کے قلم سے بھی طے پاتے ہیں اور ہمارے علماء نے کبھی ان فیصلوں کے خلاف احتجاج نہیں کیا پھر محض خلع کے باب میں یہ قید کہ اس کا فیصلہ مسلمان ہی کی عدالت سے ہو، بالکل غیر منطقی مطالبہ ہے جس کو کسی طرح تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

میں نے کامل غور کیا کہ مولانا کفایت اللہ صاحب نے ایک مسلمان فیصلہ کرنے والے کی شرط کیوں لگائی لیکن میری سمجھ میں اس کی کوئی دلیل نہیں آئی۔ اگر یہ قید انھوں نے اس ڈر سے لگائی ہے کہ مسلمان جج صحیح فیصلہ کرے گا اور غیر مسلم جج سے صحیح فیصلہ کی توقع نہیں کی جاسکتی، تو یہ اندیشہ بیکار ہے، کیونکہ فیصلہ کرنے والا کوئی ہو وہ قانون کی پابندی کرے گا۔ اور اس خیال سے خالی الذہن ہو کر فیصلہ کرے گا کہ خود اس کا مذہب کیا ہے۔ لیکن اگر مولانا نے یہ شرط اس عقیدہ کی بنا پر لگائی ہے کہ مشرک نجس ہے، تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک ”مشرک نجس“ کا فیصلہ اور تمام مسائل میں تو مان لیا جائے، لیکن ”خلع“ کے باب میں نہ مانا جائے۔ علاوہ اس کے میں یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ ایک مسلم جج کو وہ کیوں قابل ترجیح قرار دیتے ہیں، جبکہ شاید ہی کوئی مسلمان آئی۔ سی۔ اس، مولانا کے نقطہ نظر سے صحیح معنی میں مسلمان ہو۔

اگر مولانا نے یہ شرط لگائی تھی تو اسی کے ساتھ یہ پابندی بھی عاید کرنا چاہئے تھی کہ فیصلہ کرنے والا نہ صرف نام کا مسلمان ہو، بلکہ پانچ وقت کی نماز بھی پڑھتا ہو، روزہ بھی رکھتا ہو، حج بھی کر آیا ہو، باقاعدہ زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو، بیسی وار بھی رکھتا ہو، کوٹ پتلون نہ پہنتا ہو، ایک سے زیادہ شادی کرنے کا مخالف نہ ہو اور اگر کوئی عورت شہرہ کی بدسلوکی کی وجہ سے خلع کی خواہشمند ہو، تو اس کو عورت کی بیجا آزادی سمجھتا ہو۔

کیا اچھا ہوتا اگر مولانا ان تمام جھگڑوں کو چھوڑ کر صرف یہ شرط لگا دیتے کہ خلع کا فیصلہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس نے دیوبند میں تعلیم پائی ہو یا جو کسی اسلامی ریاست میں منصب قضا پر مامور ہو۔

خلع کا مسئلہ ہمارے علماء کے لئے ہمیشہ تردد کا باعث رہا ہے اور انھوں نے کبھی اپنی طرف سے کوئی اقدام ایسا نہیں کیا جس سے عورتیں اپنے اس حق سے فائدہ اٹھا سکتیں اور اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ خود اس کا ہوت بننے سے ڈرتے ہیں

نکیرین — اسلام و اشتراکیت

(محمد عبدالعزیز خاں حیدر آبادی۔ قرول باغ۔ دہلی)

آج کل جو ”وحی“ کے متعلق بحث ہو رہی ہے اس کی وجہ سے ”مولوی“ بہت ہی برہم ہیں۔ انہیں تو چاہئے تھا کہ وہ غور کرتے اور استدلال عقلی پیش کرتے لیکن انہیں تو صرف کفر کا فتویٰ دینا آتا ہے۔ اسی سلسلہ میں دو باتوں کا جواب آپ سے چاہتا ہوں:-

(۱) مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہر ایک مسلمان کے ”اعمال“ لکھنے کے لئے دو فرشتے مقرر ہیں اور روزانہ اور ہر گھڑی اُس شخص کے اعمال لکھتے رہتے ہیں۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ فرشتے ایک ”اعمال نامہ“ تیار کرتے رہیں؟ اور حشر کے دن وہ خدا کے سامنے پیش کریں اور خدا اُن کو دیکھ کر سزا یا جزا دے۔ نو ذرا بتد کیا خدا کا حافظ اتنا قوی نہیں ہے کہ وہ یاد رکھے؟ اور اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جس سے سیری طبیعت بے چین سی رہتی ہے۔ اور کوئی ٹھیک سا جواب نہیں ملتا کہ اہلذہان نصیب ہو۔ امید کہ آپ جلد ذریعہ نگار مطہر فرمائیں گے۔

(۲) کیا ”اسلام“ اور ”اشتراکیت“ کے اصول ایک ہی سے ہیں؟ ممکن ہو تو تفصیل سے بحث فرما کر سمجھائیے مشکور ہو گا۔

(نگار) ”نکیرین“ کے متعلق آپ نے ایک شاعر کا یہ اعتراض سنا ہو گا کہ:-

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی بھٹا

اس میں شک نہیں کہ اگر نکیرین کے وجود اور کتابت اعمال کو مانا جائے تو شاعر کا یہ اعتراض بھی اپنی جگہ اٹل ہے، لیکن جس طرح شاعر کے اس قول کو محض تفنن طبع سمجھا جاتا ہے، کیوں نہ آپ عقیدہ نکیرین کو بھی تفنن قرار دیں۔ آپ قطعاً مجبور نہیں ہیں کہ نکیرین کے وجود کو اسی طرح تسلیم کریں جس طرح عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ نکیرین کا اقرار عقیدہ اسلام کا جزو لازم نہیں، اس لئے آپ کی طبیعت کیوں بے چین ہے۔

(۲) اسلام و اشتراکیت دونوں ایک نہیں ہیں۔ ان میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ سب سے بڑا فرق تو یہی ہے کہ ”اشتراکیت“ مذہب ہے یا دنیاوی اور اسلام کے سامنے سب سے بڑی چیز مسلمان ہونا ہے علاوہ اسکے اسلام نے سرمایہ داری کو گوارا کیا ہے اور اشتراکیت اسکی دشمن ہے۔ اشتراکیت شخصی استبداد کو تسلیم نہیں کرتی اور اسلام میں باوجود مشورہ کی ہدایت کے حاکم کو اپنی رائے پر عمل کرنے کا اختیار دیا گیا ہے پھر

جب اصول ہی میں اختلاف ہے تو فروع میں اس سے زیادہ ہونا چاہئے اور ہے۔

مذہبیات

(جناب محی - میدک حیدر آباد - دکن)

آپ آزادانہ کسی مسئلہ پر غور کرنا انسان کا فطری حق سمجھتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ آپ ایک مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے اس لئے آپ نے اسلام ہی کی حقیقت پر غور کیا حالانکہ دوسرے مذاہب کی تحقیق کرنا اور ان میں سے کسی ایک پر مطمئن ہو جانا یا پھر ایک نیا عقیدہ تراش لینا ہی آزادانہ فکر و غور کا نتیجہ ہونا چاہئے تھا۔ ممکن ہے آپ نے ان منازل کو طے کر کے موجودہ راستہ اختیار کیا ہو۔ میں نے بھی حتی الوسع ہر عقیدہ کی چھان بین کی ہے مگر مجھے مجبوراً اپنا مسالک علیحدہ رکھنا پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ میرے ان عقاید میں قریب قریب وہ تمام باتیں شامل ہیں جو عام عقاید میں مشترک ہو کر قی ہیں۔ ہاں میں نے اپنے اس مذہب کا کوئی نا نہیں رکھا اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی کہ مجھے کوئی مسلمان دیکھے چکے میں کسی اور مذہب اور اسلام میں کوئی فرق نہیں سمجھتا مجھے سرگز ناگوار نہ ہو اگر لوگ مجھے ہندو، یہودی، عیسائی یا جو جی میں آئے کہیں یہی وجہ ہے کہ جب لوگ میرے نام کی انسانی رعایت سے مجھے مسلمان کہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوتا، اور اگر میرے عقاید سے واقف ہو کر کوئی مسلم مجھے مرتد ملحد کہتا ہے تو میں یقین کے ساتھ اسے صحیح سمجھتا ہوں اور کیوں نہ سمجھوں۔ اسلامی عقاید کے مطابق تو جو خدا و رسول یا احکامات قرآن پر ایمان نہ رکھے وہ مرتد و ملحد ہی ہوتا ہے اور مجھے واقعی خدا کے وجود سے انکار ہو تو سمجھ لیجئے کہ بقیہ لغویات کو میں کہاں تک باور کر سکتا ہوں۔

اس سلسلہ میں مجھے آپ سے ہمیشہ غائبانہ حسن ظن رہا کیونکہ میں اس مغالطہ میں تھا کہ آپ بھی میرے ہی ہم مشرب ہیں۔ یہ تو اب معلوم ہوا کہ آپ بھی مسلمان ہی ہیں مگر اپنے اسلامی عقاید کے عقلی دلائل بھی رکھتے ہیں اور جیسا کہ آپ کا بیان ہے عام علماء اسلام اپنے عقاید کے عقلی دلائل نہیں رکھتے۔ بہر حال مجھے آپ لوگوں کی اس بحث سے کوئی سروکار نہیں۔ میرے ہاں تو ہمیشہ مسلمان آپ میں اور دوسرے مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں۔ فروعات و جزئیات میں تو ہر شخص دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف خیال رکھتا ہی ہے۔

میں مذہبی مضامین بہت کم یا بقدر ضرورت پڑھ لیا کرتا ہوں مگر جب کبھی مذہب و سائنس کی بحث کسی مفید و جامع جہت پر ہوتی ہے تو اپنے عقاید کی تنقید کی خاطر اسے بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ آپ کے حالیہ تردیدی مضامین میں جو علماء کی لے دے پر نگار میں شایع ہوئے مجھے توقع تھی کہ میرے ہی معتقدات کی صاف صاف و سادہ عقلی دلائل سے کی گئی ہوگی۔ مگر

میری توقع پوری نہ ہوئی۔

خیر۔ آپ نے اپنے شبہات کی ایک فہرست نگار بابت الگ مسئلہ میں ارقام فرما کر علماء اسلام سے اس کا تسکین بخش جواب طلب فرمایا ہے۔ مگر میں آپ سے اپنی تسکین خاطر کے لئے ان سوالات سے پہلے اپنے سوالات کا ایسا حل چاہتا ہوں جو عقل کی کسوٹی پر کھرے اتر سکیں۔ امید کہ مجھے مطمئن کرنا آپ اپنا انسانی فرض سمجھیں گے۔

۱۔ خدا کیا ہے؟ اور ہے بھی کہ نہیں! دنیا اور انسان کو کس نے پیدا کیا اور کیوں؟

۲۔ جن فرشتے، پیغمبر، رسول اور انسان کی علیحدہ علیحدہ کیا صحیح تعریف ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہی بنیادی سوالات یا شبہات ہیں جن کا پہلے حل ہونا ضروری ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ آپ نے جب کبھی اپنے گرد و پیش کا آداب مطالعہ شروع کیا ہوگا تو ضرور اس منزل سے ابتداء ہی میں گزرے ہوں گے جس سے میں اس وقت گزر رہا ہوں اور جس طرح آپ کی تسکین ہوئی ہو اسی طرح میری بھی فرمائیے۔

دیگر علماء سے بھی اس مسئلہ میں مدد لی جاسکتی تھی مگر آپ کا انتخاب محض اس لئے میں نے کیا کہ آپ عقل کی کسوٹی پر عقاید پرکھا کرتے ہیں اور اسی اصول پر میں بھی اپنے شبہات کو رفع کرنا چاہتا ہوں۔

(نگار) آپ کو چاہئے تھا کہ اپنے شبہات آپ ان علماء کرام کے سامنے پیش کرتے جن کے نزدیک اسلام کا تعلق ان اصطلاحی معتقدات سے ہے اور جو قرآن کے مغز پر اتنی زیادہ توجہ صرف نہیں کرتے جتنی اس کو ”کسوت“ پر۔ لیکن حیرت ہے کہ آپ یہ باتیں مجھ سے پوچھتے ہیں جو مذہب و اخلاق میں کوئی فرق نہیں سمجھتا اور جس نے اصطلاحات مذہب کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

آپ خدا، رسول، جن اور فرشتوں وغیرہ کے متعلق میرا عقیدہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کیا نگار آپ کی نگاہ سے نہیں گزرتا۔ آپ الگ الگ کے ملاحظیات ہی ملاحظہ فرمائیے، آپ کو ان تمام باتوں کی صراحت اس میں مل جائے گی۔ رہا خدا کو ماننا یا نہ ماننا، میں نے اس مسئلہ کو کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ کیونکہ ایک قوت مجرہ کا ماننا ضروری ہے اور اس کے کوائف سے بحث کرنا بالکل بیکار ہے کیونکہ نہ ہم اس کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کا سمجھنا ہمارے لئے مفید۔

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

نگار سائیز کے ۲۴ صفحات پر — قیمت مع محصول ۱۱ روپے
منیجر نگار لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

نظم اردو | جناب سید ابوالعلاء حکیم ناطق لکھنوی کی تصنیف ہے۔ اس تصنیف کی بنیاد ناطق صاحب کی وہ نظم ہے جو نگار کے اردو شاعری نمبر میں شائع ہو چکی ہے لیکن اب اس کو کثیر حواشی کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

نظم صرف ۵۵ بند کی ہے، لیکن کتاب ۲۰ صفحات کی ہے اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس متن کی شرح و تفسیر کس قدر بسیط ہو گئی ہے۔

اردو نثر و نظم کے متعلق شاید ہی کوئی تاریخی اطلاع ایسی ہو جو اس کتاب میں نہ پائی جاتی ہو اور اس میں شک نہیں کہ ناطق صاحب نے ان تمام اطلاعات کی جمع و ترتیب میں بہت محنت و کاوش سے کام لیا ہے۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو معلومات اس میں فراہم کی گئی ہیں ان میں شک و اختلاف کی گنجائش نہیں، کیونکہ دنیا کی کوئی تاریخی یا انتقادی تصنیف اس قدر مکمل نہیں ہو سکتی، لیکن اس کا اکثر و بیشتر حصہ یقیناً استنادی حیثیت رکھتا ہے۔

شروع میں ملک کے بعض اکابر کی رائیں بھی کتاب میں شامل ہیں اور ناطق صاحب نے ان کے حصول میں جس قدر کاوش سے کام لیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید وہ بغیر ان رایوں کے کتاب کو مکمل نہ سمجھتے تھے، دراصل ایک تصنیف کی اصل خوبی اس ”مدحت طرازی“ کی محتاج نہ تھی، جس حد تک نظم کا تعلق ہے وہ بالکل بے عیب ہے سوائے اس کے کہ ایک جگہ انھوں نے عجمی کو سکون جیم کے ساتھ نظم کیا ہے، ممکن ہے ضرورت شعری کے لحاظ سے جائز ہو۔

بہر حال ناطق صاحب کی یہ تالیف قابل قدر چیز ہے اور وہ حضرات جو اردو زبان سے دلچسپی رکھتے ہیں یا اس زبان کے متعلق فوری حوالہ کے لئے کوئی کتاب اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔

کتاب کی قیمت دو روپیہ ہے۔ جناب مصنف سے کٹنو منسٹ روڈ لکھنؤ کے پتہ پر خط و کتابت کی جائے۔

گہی کی زندگی | ترجمہ ہے انگریزی کی مشہور تصنیف ”ٹام براؤنس اسکول ڈیز“ کا جو ٹامس ہیو کی زندگی کا خاص ادبی کاغذ سمجھا جاتا ہے۔ اس میں مدرسہ گہی کے واقعات کو افسانہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور نقد و سمر کی یہ

صورت بالکل ”ٹامس ہیو“ کی ایجاد ہے۔ یہ ترجمہ مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا ہے اور پھر اس کی قیمت ہے۔

لے حکیم صاحب نے صفحہ ۱۱ پر ایک جگہ لکھا ہے کہ امیر خسرو ساتویں صدی ہجری میں لکھنؤ آئے تھے، حالانکہ اس وقت شاید لکھنؤ کا وجود ہی نہ تھا۔ وہ لکھنؤ کی طرف تھے لیکن لکھنؤ کا نام اس وقت نہیں تھا۔

انگلستان کا طریقہ حکومت یہ رسالہ مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ انگلستان کا اصول حکومت کیا ہے۔ سرورق پر ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ کتاب بتدیوں کے لئے لکھی گئی ہے، حالانکہ میرے نزدیک اس کا مطالعہ بتدی و تہی دونوں کے لئے مفید ہے۔ شانتی سروپ شاستری نے اسے مرتب کیا ہے اور ایسی سہل و صاف زبان میں کہ ہر شخص آسانی سے سمجھ سکے۔ قیمت ۵ روپے۔

خندان مجموعہ ہے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ان مزاحیہ تقریروں کا جو ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر ہو چکی ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صاحب کے مزاحیہ مضامین کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، خوب لکھتے ہیں اور اپنے مخصوص رنگ کو کسی جگہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ رشید صاحب مشکل اردو لکھنے والے ہیں اور مشکل اردو میں مزاح کی تشکیل ان کی خصوصیت خاصہ ہے۔

ہر چند یہ تمام مضامین وہ ہیں جو مقررہ عنوانات پر فرمائش سے لکھے گئے ہیں اور ایک مزاحیہ نگار کو جو آزادی ملنی چاہئے وہ رشید صاحب کو نہیں ملی، تاہم جس طرح طرح کی تمام عزلیں بری نہیں ہوتیں، اسی طرح یہ مضامین بھی بڑی حد تک رشید صاحب کے مزاحیہ رنگ کے حامل ہیں، گویا انھیں "اضافہ توضیحی" کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جاسکتا۔ مکتبہ جامعہ دہلی سے خط و کتابت کی جائے۔

سلسلہ تعلیم و ترقی کے رسائل مکتبہ جامعہ دہلی نے بالغ بتدیوں کی تعلیم کے لئے ایک سلسلہ چھوٹے چھوٹے رسائل کا شروع کیا ہے، جن کے ذریعہ سے مذہب، اخلاق، تاریخ، ادب اور بہت سی کام کی باتوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ایک ایک آنہ ان کی قیمت ہے۔ فہرست مکتبہ جامعہ سے طلب کی جائے۔

جادو نو مجموعہ ہے جناب احسان دانش کے دو شعری قطعات کا جن میں انھوں نے اپنے تاثرات دنیاوی اور مظاہر مادی کو شاعرانہ تخیل کے ساتھ نادر استعارات و تشبیہات کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس رنگ کی ابتدا سب سے پہلے امین حنزیں نے کی تھی لیکن شعریات اس میں کم تھی، اس کے بعد اختر انصاری نے اس رنگ کو بہت اُبھارا، پھر جوش و احسان نے۔

مگور کے تمنغ میں اس رنگ کی نشر تو پہلے بھی لکھی جاتی تھی، لیکن نظم میں یہ رنگ پیش کرنا بعد کی بات ہے جناب احسان اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا اندازہ آپ ذیل کے قطعات سے کر سکتے ہیں:

بے زری اور اس میں ان کا خیال اک تجلی سی ہے نگاہوں میں
دل پہ ایسا ساں مسلط ہے چاندنی جیسے خانقاہوں میں

دہلی کا اک ریتیں بہ ہنگام جانکنی،
جیسے فسوں گردوں کے جھیلے میں نیم شب
سرد صحن رہا تھا چارہ گردوں میں گھرا ہوا
کھیلے سیاہ ناگ کا تازہ ڈسا ہوا

جب کسی کی یاد آکر تلملا جاتا ہے دل
جیسے ساون کی برستی رات میں اک نازنیں
جگمگا اٹھتی ہے کچھ اس شان سے بزمِ دماغ
صحن میں زینے سے اترے ہاتھ میں لیکر چراغ

بڑے سایہ میں چاندنی کا سماں
جیسے حساس آدمی کی حیات
تیرگی میں ہیں نور کے پیو مند،
ہو زیادہ ملول کم خور سند،
یہ مجموعہ مکتبہ دانش مزنگ لاہور سے مل سکتا ہے۔

جناب نور الحسن صاحب نے ہمارے معاشرہ کے بعض مسائل کا افسانہ کے رنگ میں بحث کی ہے جو بحیثیت مجموعی
کافی دلچسپ ہے۔ قیمت ۸ روپے اور ملنے کا پتہ: معتمد انجمن ترقی اردو حیدر آباد (دکن)

جناب عرش تیموری کا مختصر سا ڈرامہ ہے جس میں تجزیہ نفسیاتی سے کام لیتے ہوئے انھوں نے
خیال آفریں دماغ بتایا ہے کہ:

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال

انداز بیان دلکش ہے اور جو اثر اس کے مصنف نے پیدا کرنا چاہا تھا اتنا اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔
قیمت ۲ روپے، ملنے کا پتہ: حالی پبلشنگ ہاؤس، کتاب گھر، دہلی

ترجمہ ہے موسیو گیلے کے آپرا "تائیٹس" کا۔ اناطول فرانس کا ناول تائیٹس بہت مشہور چیز ہے اور
اسی کو سامنے رکھ کر موسیو گیلے نے آپرا لکھا تھا، جس کا ترجمہ اردو میں جناب پطرس نے کیا ہے۔

ہر چند آپرا کا ترجمہ کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ اس کا تعلق زیادہ تر سماعت و بصارت سے ہے، لیکن فاضل مترجم نے تمام
خلایا کو الفاظ سے پُر کر کے ایک تمثیل کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ ترجمہ کی خوبی کے متعلق کچھ لکھنا ایسا ہی بیکار ہے، جیسا
پطرس کے متعلق یہ ظاہر کرنا کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں

کتاب نہایت اہتمام سے مجلد شائع کی گئی ہے اور ہاشمی بک ڈپو لاہور سے مل سکتی ہے۔

جناب سید مسعود حسن صاحب مسعود (علیگ) پی۔ سی۔ اس کے کلام کا مجموعہ ہے، ابتدائی
۵ صفحات انتساب، التماس، تعارف، مقدمہ اور تبصرہ کے لئے وقف ہیں۔ اس کے بعد معلومات

شاعری پر ایک بسیط مقالہ مصنف کا نظر آتا ہے جس میں شاعری کے عیوب و محاسن پر فنی نقطہ نگاہ سے مفید بحث کی گئی ہے

اصل مجموعہ غزلیات سے شروع ہوتا ہے، اس کے بعد وہ قصاید و منظومات ہیں جو رد و ساد و غیرہ کی شان میں لکھے گئے ہیں اور پھر قطعات تاریخ میں۔ غزلوں کا رنگ وہی ہے جو لکھنؤ کے آخری دور کے شعراء کا تھا اور قصاید بھی اسی انداز کے ہیں جو عام طور پر لوگوں کی تعریف میں اختیار کیا جاتا ہے۔ مقدمہ جناب آسی صاحب کا لکھا ہوا ہے اور تبصرہ سراج لکھنوی کا۔ یہ مجموعہ غالباً جناب مسعود حسن صاحب سے تاج پور ضلع لکھیم پور کھیری کے پتہ سے مل سکتا ہے۔

گل نغمہ جناب صفا حیدر آبادی کی چند غزلوں کا مجموعہ ہے مولوی علی اختر صاحب نے تعارف کرتے ہوئے، ان کے مستقبل کی طرف سے بہت اطمینان کا اظہار کیا ہے اور وہ ان کی تلاش مضمون کے معترف ہیں۔ قیمت ۶ روپے اور ملنے کا پتہ میر حیدر علی صفایا قوت پورہ حیدر آباد (دکن) ہے۔

آسان اردو مجموعہ ہے حیدر آباد کے مختلف اہل قلم کے مضامین کا پہلے حصہ میں بعض اکابر کے حالات پائے جاتے ہیں۔ دوسرے میں تین سماجی کہانیاں ہیں اور تیسرے حصہ میں جدید معلومات۔ آخری حصہ نظموں، رباعیوں اور غزلوں کا ہے۔ لیکن ہر جگہ آسان اردو کے خیال کو سامنے رکھا گیا ہے اور اسی کے خیال کے تحت انتخاب کیا گیا ہو۔ قیمت ۸ روپے۔

اسلامی تعلیم یہ رسالہ ظہیر احمد صاحب عثمانی نے چھوٹے بچوں کے لئے لکھا ہے۔ اس میں انھیں چند ابتدائی معقدمات کو پیش کیا گیا ہے جو عام طور پر جزو ایمان سمجھتے جاتے ہیں۔ قیمت ۲ روپے۔ ملنے کا پتہ کتابخانہ "سعادت" بازار ڈوگرال سلاہٹو۔

ہمارے بزرگ اس کتاب میں رشید اختر ندوی نے مسلمان بچوں کے لئے خلفاء اربعہ کے حالات سہل زبان میں یکجا کر دئے ہیں۔ قیمت ۸ روپے اور ملنے کا پتہ کتاب خانہ "سعادت" لاہور۔

تذکرۃ الانصار اس رسالہ میں جناب حکیم شمس الحق صاحب انصاری زیدی نے پارچہ بات قبیلوں کی اصل و حقیقت سے بحث کر کے بتایا ہے کہ جن کو جلاہا کہا جاتا ہے وہ فی الحقیقت انصاری ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ذات پات کی تقسیم کو ہمیشہ برا سمجھا ہے اور محض کسی پیشہ اختیار کر لینے کی وجہ سے کسی قوم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا بدترین لعنت ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ مسلمان اب اصل مذہب کو چھوڑ بیٹھے ہیں اور صرف "نسب فروشی" ہی کو شرافت سمجھتے ہیں۔

یہ رسالہ ۲ میں شمس دو خانہ تربت کلکتہ سے مل سکتا ہے۔

جنگ لودھ و نیا جناب وینکٹیشن نرائن تیواری نے موجودہ جنگ کے متعلق یہ مفید کتاب لکھی ہے۔ اس کے پہلے حصہ میں جنگ کے اہم واقعات کی فہرست دی گئی ہے، دوسرے حصہ میں مختلف ملکوں کے نقشے اور چارٹ ہیں، تیسرے حصہ میں چند مفید و کارآمد ضخیمے دئے گئے ہیں۔ موجودہ جنگ کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ فائدہ مند خالی نہیں۔

ملنے کا پتہ انڈین پرس ال آباد ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

اقبال کی شاعری | مولانا عبدالمالک آرومی کی تصنیف ہے اور غالباً سب سے پہلی انتقادی تصنیف جس میں زیادہ گہرائی کے ساتھ اقبال کی شاعری پر گفتگو کی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے اقبال کی سخن گوئی پر نہ صرف سخن سنج، بلکہ ایک آرٹسٹ اور فلسفی کی حیثیت سے بھی تبصرہ کیا ہے اور ہر ممکن پہلو کو سامنے رکھ کر اس پر گفتگو کی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا، لیکن اس کی مانگ اتنی زیادہ ہوئی کہ اب یہ دوسرا ایڈیشن تین جزو کے اضافہ کے ساتھ شائع کرنا پڑا۔ اخیر میں کلام اقبال کا انتخاب بھی دیدیا گیا ہے جس نے اس کتاب کی افادی حیثیت کو اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔ آرہ کا ”ادارہ طاق نسیاں“ جس کے خالق و محرک مولانا عبدالمالک ہی ہیں، مستحق مبارکباد ہے کہ اس نے اس کتاب کو شائع کر کے اردو کے انتقادی لٹریچر میں ایک معیاری چیز ملک کے سامنے پیش کی۔

الہامات شاد | ادارہ طاق نسیاں آرہ کے سلسلہ مطبوعات کی تیسری کتاب ہے۔ اس میں مولانا عبدالمالک آرومی نے پہلے شاد عظیم آبادی کی سیرت بیان کی ہے اور پھر ان کے کلام پر ایک فاضلانہ تبصرہ کر کے شاد کی شاعری کے حقیقی اجزاء کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فاضل مصنف نے اس حق کو پوری طرح ادا کیا ہے جو بہاری ہونے کی حیثیت سے ان پر عاید ہوتا تھا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ بہاری اسکول کی شاعری سمجھنے کے لئے کوئی شخص اس کتاب کے مطالعہ سے کیونکر بے نیاز ہو سکتا ہے۔

اخیر میں شاد کے کلام کا انتخاب بھی شامل ہے جس میں ان کے ہر رنگ کو سامنے رکھا گیا ہے۔ قیمت ۸ روپے کا پتہ : ادارہ طاق نسیاں آرہ

شہاب کی تختل | مجموعہ ہے جناب افسر صدیقی امر وہوی کے کلام کا جس میں اغزیں، قصیدے، نظمیں اور ترجیع بند وغیرہ بھی کچھ شامل ہیں۔

افسر صاحب پرانے کہنے والے ہیں اور کثرتِ مشق سے کلام میں استادانہ سلاست و شگفتگی پیدا ہو گئی ہے۔ مختلف ادبی صحبتوں میں آپ کو چند خطابات بھی مل چکے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پبلک آپ کی قدر کرتی ہے اور آپ کے کلام کو پسند کرتی ہے۔ آپ کا کلام رکیزک و نحیف مضامین سے پاک ہے اور صحیح رنگ تعزل کے اشعار بھی اس میں تلاش سے مل جاتے ہیں۔ قیمت درج نہیں ہے

نئی پود | جناب ازہر قدوائی کے فسانوں کا مجموعہ ہے جن میں روز کے واقعات و تجربات کو سامنے رکھ کر اجتماعی نقطہ نظر سے ہمارے معاشرہ پر بحث کی گئی ہے۔ ان افسانوں میں لفاظی تو نہیں ہے، لیکن مفید باتیں ضرور ہیں۔ زبان صاف و سلیس اور انداز بیان دلنشین ہے۔ کتابت و طباعت بھی بہت پاکیزہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ اور پتہ شرکت ادبیہ دہلی۔

انتقام

میتوں سے آج جوئے شیر لانا ہو مجھے شمع اک، آغوش طوفاں میں جلانا ہو مجھے
دل کے شعلوں سے لگی دل کی بجھانا ہو مجھے آج اپنی قوتِ دل آزمانا ہے مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

دشمنِ ادراک سے لینا ہے مجھ کو انتقام رہزنِ بیباک سے لینا ہے مجھ کو انتقام
اک بتِ سفاک سے لینا ہے مجھ کو انتقام یاد میں اُس کی خود اُس کو بھول جانا ہو مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

چاند سے خنکی، گہرِ شبنم سے، تاروں سے چمک رنگ و بو گل سے ہنسی غنچوں سے، شاخوں سے لپک
مستیاں مے سے، گھٹا سے کیفِ نغموں سے کھٹک حُسنِ لمبا سے جہاں بھی لوٹ لانا ہے مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

چھین لانا ہے مجھے اب حُسن سے تیغ و سناں حُسن سے تیغ و سناں اور عشق سے تیر و کماں
عشق سے تیر و کماں تقدیر سے سود و زیاں بخت و حسن و عشق کو کیجاں بنانا ہے مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

رات ہو یا دن ہو مثلِ ابر باراں روئے جا جتنا رو یا جائے تجھ سے روئے جا ہاں روئے جا
حوصلہ باقی نہ رکھ اے چشمِ گریاں روئے جا دردِ دل پر ہنسنے والے کو رُلانا ہے مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

توڑ کر ہر سازِ اب نعمات سے کھیلوں گا میں بھر کے غمِ رگِ رگ میں احساسات سو کھیلوں گا میں
ٹکڑے ٹکڑے کر کے دل جذبات سے کھیلوں گا میں کھیل میں تقدیر کو اپنی لگانا ہے مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

وسعتِ دُنیا کے امکاں تنگ ہو میرے لئے بخودی ہو یا خودی اب تنگ ہے میرے لئے
ہر نفسِ گویا پیامِ جنگ ہے میرے لئے کرسی و لوح و قلم کو زدیں لانا ہے مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

حسرت و ارباں کی بنیادیں ہلا دوں تو سہی عشق سے رسمِ طالبِ یکسر مٹا دوں تو سہی
باشِ اے تمکیں خدا کو بھی بھلا دوں تو سہی بھول جانے کے سوا سب بھول جانا ہو مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

تمکین (سرمد)

آثر لکھنوی

غزل :

اب اس دل وحشی کے سمجھانے کو کیا کہئے
آغوش تجلی میں غش آنے کو کیا کہئے
اُس دل کی تمنائیں مٹ جانے کو کیا کہئے
خود اپنی اداؤں سے شرانے کو کیا کہئے
ملنے ہی اُن آنکھوں کے جھک جانے کو کیا کہئے
آغاز محبت کے افسانے کو کیا کہئے
گلبرگِ شبِ بنم کے تھرانے کو کیا کہئے
سمجھانا اگر یہ ہے، تڑپانے کو کیا کہئے
پھر بھی جو چھلک جائے، پیمانے کو کیا کہئے
جاگی ہوئی آنکھوں کے بھر آنے کو کیا کہئے
دیوانہ نہ کہئے تو پروانے کو کیا کہئے
جب زیست مسلسل ہے، مرجانے کو کیا کہئے

امید تلی سے گھبرانے کو کیا کہئے
بیتاب تماشا دل، محروم تماشا ہے
جس دل کی تمنائیں سرایہ ہستی تھیں
مانا کہ حیا آئی مشتاق نگاہوں سے
شکل سے جو اٹھی تھیں پلوں کے سہارے سے
جب دل کے دھڑکنے میں آغوش کی تنگی تھی
جس وقت نسیم آئے پیغامِ سحر لے کر
دیتے ہو تلی بھی اور ہاتھ بھی ملتے ہو
گردش تھی ابھی مبہم ساقی کی نگاہوں کی
جب پھول مہکتے ہوں اور چاندنی چھٹکی ہو
اک شعلہ مضطر سے بن گئے تپش لپٹا
مستقبل تازہ ہے جو خاک کا ذرہ ہے

نالوں نے اثر کے پھر منگائے کیا برپا
منہ پھیر کے پھر کہو "دیوانے کو کیا کہئے"

کوکب عارفی

غزل :

ہر نفس اُس کے لئے ہر مدعا اُس کے لئے
ابتدا اس کے لئے ہے انتہا اُس کے لئے
خوشنما پھولوں کو میں دیکھا کیا اُس کے لئے
جو نہ سننا چاہئے تھا وہ سنا اسکے لئے
آرہی ہے دل سے رونے کی صدا اسکے لئے

کس مصیبت میں ہوں میں اے مہنوا اسکے لئے
میری ہر کوشش کی تیرے میں موجزن اسکی تلاش
میں نے کلیوں میں اُسے پایا تبسم آشنا
جو نہ کہنا چاہئے تھا وہ کہا احباب نے
میرے قبضے میں نہیں ہیں مجر کی مجبوریاں

گم ہوا ہوں اس طرح کوکب میں اسکی یادیں
اُس سے پوچھا بار بار اپنا پتا اُس کے لئے

مشاہدہ اور پیام

شاعر اور کائنات

یہ کس نے کیا ذکر تمنا مرے آگے
ہر حال میں سنتا ہوں محبت کی کہانی،
ہونے دو ابھی سا غر و مینا میں تصادم
محرابِ حرم کا نہ کرو ذکر خدا را
اللہ رب الاربعین در پہ مری خاک نشینی
ہر ذرہ ہے ناہید و ثریا مرے نزدیک
دیکھی ہے مری آنکھ نے کلیوں کی تباہی
اُبھیں ترے رخسار سے گستاخ نگاہیں
لہرا نے لگا، خون کا دریا مرے آگے
ہر ذرہ خاموش ہے گویا مرے آگے
بہنے دو ابھی نور کا دریا مرے آگے
جب تک ہے خمِ ابروئے سلما مرے آگے
ہیں خاک بسرِ قیصر و کسریٰ مرے آگے
ہر خار ہے گلگشتِ مصلّا مرے آگے
اُٹھا ہے تبسم کا جنازا مرے آگے
تو اور ہو مجروحِ تاشا مرے آگے
کونین کو ماتہر مرے قدموں پہ جھکا نا،
جس وقت کہ ہو گنبدِ خضریٰ مرے آگے

امید کیا ہے؟

یہ تو کس قزع ہے، اور وہ تارے ہیں
امید کے خوشنما کھلونوں کو نہ چھو،
فلسفی سے!
ترے جلووں میں تابانی نہیں ہے
زمانہ کو بدل سکتا نہیں تو
غمہائے نشاط ہی کے سب مارے ہیں
تو پھول سمجھتا ہے یہ انگارے ہیں
تری تخلیق قارانی نہیں ہے
کہ تجھ میں جذبِ طوفانی نہیں ہے

ماہر القادری

غزل:

فراق گودکھپوری

اب انقلاب کو دنیا میں عام ہونا ہے
 نکل رہیں گے ہزاروں نشاط کے پہلو
 اسی پر ایک جدائی کی رات بھاری ہے
 اثر ہے ظلمت ماضی کا دورِ حاضر پر
 قریب منزل مقصود آگئی لیکن
 ہر ایک روپ میں تیرا ہی رنگ جھلکے گا،
 نظام دہر مکمل بھی ہو کے برہم ہے
 جہاں میں یوں بھی نئی روح پھونک دیتے ہیں
 وہ تیغ زہر میں جس کو بجھا چکا ہے عشق
 رُکے تو یاس چلے تو وہی نسیم مراد
 غم و خوشی کو سمجھتے ہیں زندگی جو فراق

کوئی کرے نہ کرے یہ تو کام ہونا ہے
 ابھی فسادِ غم کو تمام ہونا ہے
 وہ کیفِ غم جسے کیفِ دوام ہونا ہے
 ہر ایک صبح کو دنیا میں شام ہونا ہے
 مسافروں کو بھی کچھ تیز گام ہونا ہے
 ہر ایک نام کو تیرا ہی نام ہونا ہے
 کہ عشق کا بھی کوئی انتظام ہونا ہے
 عروسِ مرگ کا تجھ کو پیام ہونا ہے
 اب آج کل میں اُسے بے نیام ہونا ہے
 سکونِ غم کو بھی اب خوش خرام ہونا ہے
 یہ زندگی ابھی اُن پر حرام ہونا ہے

کوئی ہے

راج بلدیوراج

غزل:

آزادی غم ہے مجھے اس دور میں حاصل
 ہے دور بہت دیر و حرم سے مرا معبد
 لرزیدہ ہے تو بادِ مخالفت سے - وگرنہ
 تعمیر تو مانا کہ بڑی چیز ہے لیکن،
 تو چاہے تو تلوار کی قسمت کو جگا دے
 ان دونوں پہ ہے عشق کے ہنگامے کی بنیاد
 بے سُرخ و بے رنگ ہے افسانہ ہستی
 جرات کو بڑھا دیتی ہے زنجیر کی جھنکار
 زنداں کی طرف چل تو سہی جوشِ وفا میں
 ناداں تجھے دنیا میں کہیں خوار نہ کر دے
 مانا کہ عجب شے ہے غم عشق و غم دوست

آزاد کوئی جس میں نظر ہے نہ کوئی دل،
 زناں کا بندہ ہوں نہ تسبیح کا تائل
 ہر موج کے آغوش میں مستور ہے ساحل
 تحزیب بھی ہے قسمتِ تعمیر میں داخل
 تجھ میں وہ جھلکتا ہے ابھی جو ہر تابل
 دونوں ہیں خطا دار، تری آنکھ - مرا دل
 جب تک کہ لہو دل کا نہ اشکوں میں ہو شامل
 زنداں بھی ہے اک مکتبِ آزادی کا مل
 زنداں سے نکلوائیں گے خود طوق و سلاسل
 یہ موسمِ پیکار میں تڑپیں محافل
 یہ شرط ہے لیکن غم ہستی نہ ہو شامل

قیصر امراؤتی

غزل:

خیالِ عشرتِ ناپائیدار رہنے دے خزاں نصیب امید بہار رہنے دے
جنونِ عشق میں پروانہ کر زمانے کی جو تہمتیں ہوں ترے سر ہزار رہنے دے
نہ مڑ کے دیکھ گزشتہ کو رہرو منزل اٹھا ہی کرتے ہیں اکثر غبار رہنے دے
ہجومِ یاس میں تسکین کا کچھ تو ساماں ہو دُعا کا دل میں فقط اعتبار رہنے دے

خلش نہ ہو تو نہیں لطفِ زندگی قیصر
نہیں ہے کچھ تو غمِ روزگار رہنے دے

جگر بیلوی

غزل:

جلوؤں میں حسن کے ہیں تقاضے نہاں کئی ہیں ساتھ ساتھ عشق کے ارمان کئی
آساں بہت ہے کہنے کو یوں راہِ بیدلی تھک تھک کے رہ گئے ہیں یہاں کارواں کئی
دیکھی ہیں ہم نے اُن کی تلون مزا جیاں گزرے ہیں ہم پہ دور بہار و خزاں کئی
مانا بہت جنوں نے سبکدوش کر دیا سر پہ تو سر کے ساتھ ہیں بارگراں کئی
تعمیرِ دل بنا کے بھی دیکھو تو ایک بار تم نے بنا بنا کے بگاڑے جہاں کئی
ہرچند برسبیل شکایت نہیں، مگر شکوے ہیں آپ سے مجھے اے مہرباں کئی
غفلت کبھی، ملال کبھی اور جنوں کبھی اُن کے میرے حجاب رہے درمیاں کئی
تیرے ہی سنگِ در پہ مٹا درِ دبستگی سر رکھ کے ہم نے دیکھ لئے آستان کئی
تسکینِ جاں ہو جس سے وہی مل سکا نہ آہ ملنے کو دلنوازلے مہرباں کئی

کیا زندگی سے ہو کوئی عہدہ برآ جگر
اک جانِ زار اور غمِ جانستہاں کئی
نظر حیدر آبادی

غزل:

تو غم سے نگاہیں پھیر تو لے، بدست تو بن، سرشار تو ہو دنیا کی جہیں جھک جائے گی دنیا سے ذرا بیزار تو ہو
سب ہم پر پہننے والے ہیں، سینوں میں انکے پتھر ہیں افسانہ غم یاں کس سے کہیں، محفل میں کوئی غنچوار تو ہو
کہنے کو تو اب بھی آتی ہے، سرشار ہوا بدست گھٹا اس باؤلے موسم سے حال، ہاں دل میں کوئی آزار تو ہو

دی مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہاز ران کمپنی

خاص حج سروس

تھوڑے تھوڑے وقفے سے بمبئی و کراچی سے جدہ کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام
نئی وضع کے سات جہازوں کا شاندار بیڑہ جس میں جہازوں کا سرتاج ایس ایس "اسلامی"
(وزن ۵۸۷۹ ٹن) بھی شامل ہے۔ گزشتہ موسم حج میں جبکہ جنگ کی وجہ سے جہاز رانی کے مصارف بہت
زیادہ بڑھ گئے تھے مغل لائن نے نہ تو حاجیوں سے زیادہ کرایہ لیا نہ حج سروس بند کی۔
بمبئی اور کراچی سے عدن۔ جدہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں نیز پورٹ لونی اور مارسیش
تک مسافر اور بار برداری کی سروسیں۔

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہیں۔
تفصیلات کے لئے خط و کتابت کیجئے

ٹرنر مارین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶۔ بینک اسٹریٹ بمبئی